# شریعت بدل نہیں سکتی!

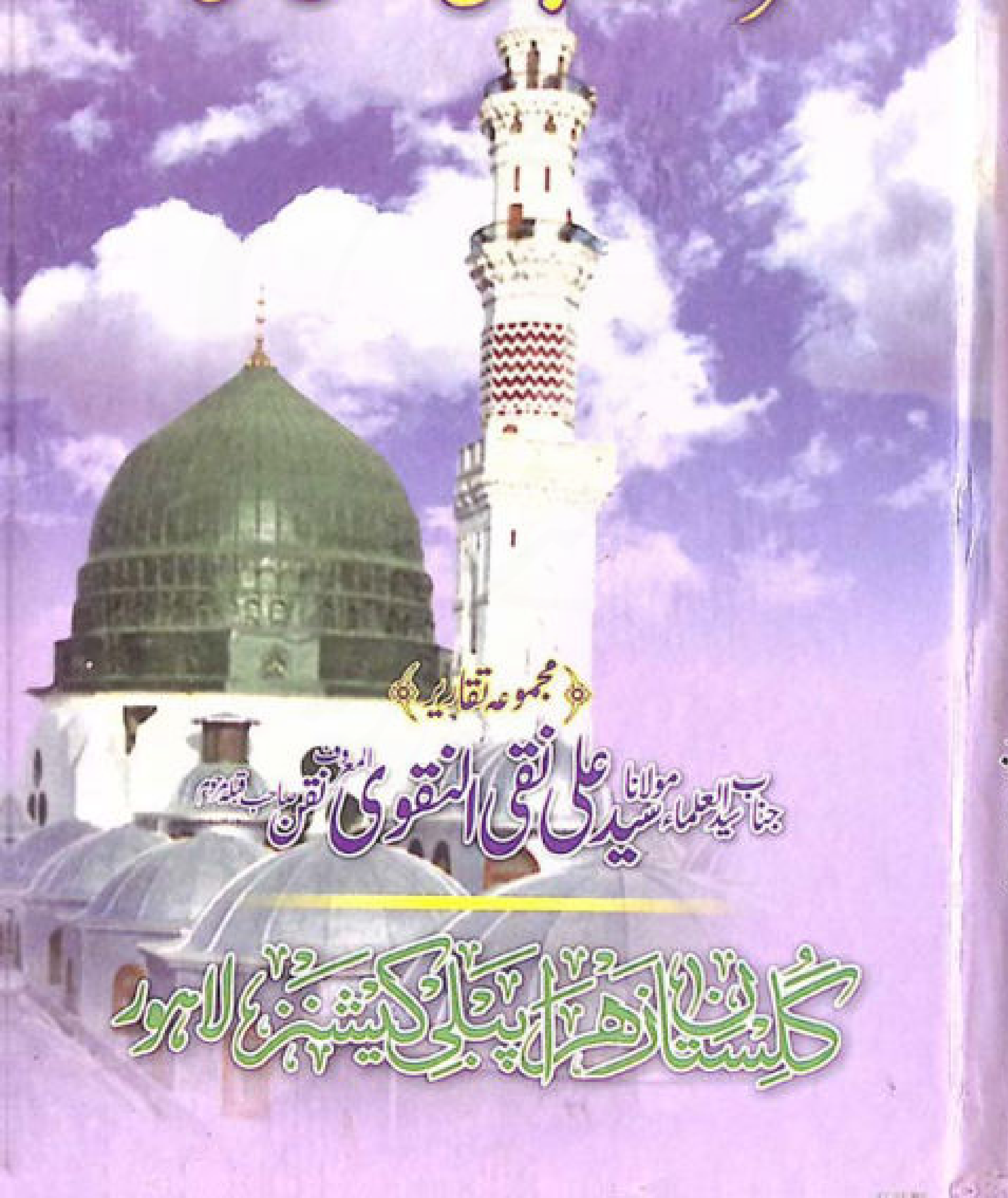

مجموعہ تقاریر

جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی المعروف نقن صاحب قبلہ مرحوم

گلستان زہرا پبلی کیشنز لاہور

گلستان زہرا کی ایک اور فخریہ پیشکش

# شریعت بدل نہیں سکتی!

(مجالس عشرہ محرم الحرام 1980ء کراچی)

﴿مجموعہ تقاریر﴾

جناب سید العلماء مولانا

## سید علی نقی النقوی

المعروف نقن صاحب قبلہ مرحوم

﴿ناشر﴾

خلیفہ سید حسن مہدی


گلستان زہرا پبلیکیشنز

۲۶۔ ایبٹ روڈ

لاہور۔ 54000

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب: شریعت بدل نہیں سکتی
مجموعہ تقاریر: جناب مولانا سید علی نقی نقن صاحب قبلہ مرحوم
نظر ثانی: سید حسن ظفر نقوی
ناشر: خلیفہ سید حسن مہدی
اشاعت اول: رمضان المبارک 1424ء
اشاعت دوم: ذیقعد 1432ء
تعداد: ایک ہزار
کمپیوٹر کمپوزنگ: ایم ایم بی
مطبع: نمرود ے انٹر نیشنل 9 ریٹی گن روڈ لاہور۔
قیمت: /150 روپے
ملنے کا پتہ: گلستان زہرا۔ ۲۶ ایبٹ روڈ لاہور۔
افتخار بک ڈپو اسلام پورہ لاہور۔

# انتساب

ماں کی طرح چاہنے والی

ہمشیرہ مرحومہ

سیدہ نرجس خاتون بنت خلیفہ سید سعادت حسین مرحوم

کے نام

# فہرست



| نمبر شمار | عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| 1 | پیش لفظ | 5 |
| 2 | عرض ناشر | 7 |
| 3 | مجلس اول | 9 |
| 4 | مجلس دوم | 27 |
| 5 | مجلس سوم | 47 |
| 6 | مجلس چہارم | 68 |
| 7 | مجلس پنجم | 91 |
| 8 | مجلس ششم | 113 |
| 9 | مجلس ہفتم | 135 |
| 10 | مجلس ہشتم | 157 |
| 11 | مجلس نہم | 173 |

## پیش لفظ

شریعت سے مراد انبیاء و مرسلین کا وہ طریقہ ہوتا ہے جسے وہ اپنے زمانے کے حالات وضروریات کے پیش نظر خدا کی رہنمائی اور اس کے نازل کردہ دین کی روشنی میں اختیار کرتا ہے۔ حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بعد اب کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہونے والا ہے اور نہ ہی قرآن کریم کے بعد اب کوئی اور کتاب نازل ہونے والی ہے۔ اس لیے شریعت محمدی ﷺ ہی وہ شریعت الٰہی اور طریقہ زندگی ہے جو قیامت تک جاری وساری رہے گی اور بشریت کے لیے اس پر عمل لازمی قرار دیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عمداً یا سہواً خود مسلمان اس دین کو آدھا لیتے ہیں اور آدھا چھوڑ دیتے ہیں نتیجے کے طور پر غیر مسلم دنیا سے یہ بات اٹھتی ہے کہ اسلام پر عمل کر کے زندگی گذارنا ناممکن ہے۔

یہی وہ مشکل مسئلہ ہے جسے نامور عالم دین آیۃ اللہ سید العلماء سید علی نقی نقوی (نقن صاحب) اعلی اللہ مقامہ نے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تقاریر کا زیر نظر مجموعہ جس کا عنوان "شریعت الٰہی میں تبدیلی ناممکن ہے" ان تقاریر پر جواب تاریخی سند کے طور پر تحریری صورت میں سامنے لائی جارہی ہیں میرا کچھ تبصرہ کرنا چھوٹا منہ بڑی بات یا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا، کیونکہ برصغیر بلکہ عالم تشیع میں وہ اہل فکر و نظر ہو سکتا ہے جو علامہ کے تبحر علمی، راست فکری اور تقریری وتحریری صلاحیتوں کا معترف نہیں۔ تقاریر کا یہ مجموعہ روایتی کتب سے مختلف ہے چونکہ شریعت الٰہی عالمگیر اور دوائمی شریعت ہے اور غیر متبدل ہے اس لیے اس کا "سمجھنا اور سمجھانا" دونوں ہی اخلاص عمل اور شرح صدر کا طالب ہے۔

شریعت اسلام کے ایک حصے میں اصول وکلیات بنائے گئے ہیں جبکہ دوسرے حصے میں پیغمبر اکرام کا طرز زندگی جسے ہم سیرت طیبہ کا نام دیتے ہیں شامل ہے۔ تیسرے حصے میں آئمہ طاہرین کا حفاظت دین کا فریضہ انجام دینے کا عمل ہے۔

سرکار سید العلماءؒ جو تحریر و تقریر کے میدان کے یکتا شہسوار تھے جنھوں نے شریعت کے ان تمام حصوں پر حسب ضرورت بحث کی ہے۔ یہ انہی کا خاصہ ہے کہ مشکل ترین موضوعات کو سادہ اور سہل بنا کر اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی مطالب کو با آسانی سمجھ لیتا ہے۔

اس قحط الرجال کے دور میں خلیفہ خاندان اور ان جیسے چند افراد کا دم غنیمت ہے جو چراغ سے چراغ جلانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ان تقاریر کو شائع کرنے کے جہاں اور مقاصد ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ شاید کچھ منبر پر بیٹھ کر دین اور عقیدے کے نام پر تشیع کی بنیادوں پر حملہ کرنے والے لوگ ان تقاریر کو پڑھیں اور انھیں استدلال کا انداز معلوم ہو کہ پڑھے لکھے علماء اور ذاکرین آج ان جاہلوں کے ہاتھوں تنگ آ چکے ہیں جو لوگوں کے جذبات کا استحصال کرتے ہیں۔ اور لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اللہ اور رسولؐ کی ناراضگی مول لیتے ہیں۔

اس مقام پر میں ان علماء خطباء اور ذاکرین کو خراج عقیدت اور خراج تحسین ضرور پیش کرونگا جو جہل کے اندھیروں میں امید کی کرن بن کر جگمگا رہے ہیں۔ اور ان سامعین کا بھی شکریہ ضرور ادا کرونگا جو زبان کے چٹکاروں سے زیادہ گفتگو کی گہرائی اور گیرائی پر نظر رکھتے ہیں۔

والسلام

حسن ظفر نقوی

# عرضِ ناشر

برادرِ محترم بدرالحسن حیدر صاحب نے چند ماہ پہلے مجھے سید العلماء مولانا سید علی نقوی النقوی (نقن صاحب) اعلیٰ اللہ مقامہ کا ایک عشرہ (ویڈیو پر) بعنوان "شریعت بدل نہیں سکتی" بغرض اشاعت بھیجا۔ سید العلماء مرحوم نے یہ عشرہ 1980ء میں جناب سید علی متقی جعفری صاحب مرحوم کے عزاخانہ محفل شاہ شہیداں عامل کالونی کراچی میں پڑھا تھا۔

جناب سید علی متقی جعفری صاحب مدظلہ العالی کے فرزند سید نجم الحسن جعفری صاحب ہر سال محرم الحرام کی مجالس کرواتے ہیں۔ اور بحمد اللہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ بہترین خطیب کو مدعو کریں۔ غالباً 1978ء میں پہلی مرتبہ مولانا ڈاکٹر سید کلب صادق صاحب نے عشرہ اولہ سے خطاب کیا۔ اس دوران نجم الحسن جعفری صاحب نے اُن سے خواہش کا اظہار کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ مولانا سید العلماء مولانا سید علی نقوی النقوی (نقن صاحب) سے گذارش کریں کہ وہ خطاب فرمائیں۔ انہیں اس میں کامیابی حاصل ہوئی اور 1979ء سے مسلسل 1984ء تک (6 سال) مولانا صاحب نے مجالس سے سامعین کو مستفیض فرمایا۔

1980ء میں ان مجالس کی ویڈیو مولانا صاحب کی اجازت سے تیار کی گئی۔ ایک بات یہاں لکھنی مناسب ہوگی کہ نقن صاحب قبلہ کی پہلی ویڈیو ماڈل ٹاؤن لاہور میں جہاد کے موضوع پر تیار کی گئی اور وہ تقریر جناب نے خود دیکھی اور یہ کہا کہ "میں نے اُسے سنا ہے دیکھا نہیں"۔ اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ 1980ء میں یہ عشرہ مجالس ریکارڈ کی گئیں۔ وہ سہولتیں جو اس وقت میسر ہیں اس وقت دستیاب نہیں تھیں اور ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ 1983ء اور 1984ء میں پاکستان ٹیلی ویژن نے آپ کی دو تقریریں ریکارڈ کرائیں جو 8 محرم الحرام کو بعنوان "معیارِ وفا اور امنِ عالم" نشر ہوئیں۔ ان تقاریر کو نشر

کروانے کے سلسلہ میں سید کاظم علی شاہ صاحب مرحوم (گوجرانوالہ) اور اس وقت کے وفاقی وزیر اطلاعات جناب ظفرالحق صاحب اور چوہدری شجاعت حسین صاحب کے تعاون کے انتہائی ممنون ہیں۔

ان تقاریر کو ویڈیو سے ضبط تحریر میں لانے کے لیے میں عزیزی ڈاکٹر تفہیم اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر طاہرہ کا انتہائی ممنون ہوں اور ان کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔ انہوں نے انتہائی محنت اور توجہ سے اس کو تحریر کیا معصومین علیہم السلام ان کی اس کاوش کو قبول فرمائیں۔

نقن صاحب قبلہ نے کراچی کے بعد لاہور میں بھی بدرالحسن حیدر صاحب B-6 ماڈل ٹاؤن لاہور اور عزاخانہ گلستان زہرا 26۔ ایبٹ روڈ پر بھی یادگار مجالس سے خطاب فرمایا۔ لاہور میں آپ کا قیام میرے ماموں خلیفہ سید غلام السیدین مرحوم کے پاس ہوا کرتا تھا۔ اگر وقت نے مہلت دی تو انشاءاللہ سید العلماء کی مزید مجالس کو شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

ہم جناب سید نجم الحسن جعفری سید بدرالحسن حیدر اور ان کے اہل خانہ کے لیے دعا گو ہیں کہ مجالس کے انعقاد میں جو محنت کرتے ہیں خدا ان کی توفیقات میں مدد فرمائے اور درازی عمر عطا کرے تاکہ اسی جذبہ محبت سے دین اسلام کی خدمت کرتے رہیں اور مومنین کو فیض پہنچاتے رہیں۔ ملتمس ہوں اپنی دعاؤں میں اس ناچیز کو فراموش نہ فرمائیں میرے والدین مرحومین و دیگر اموات خلیفہ خاندان و ہمشیرہ محترمہ سیدہ نرجس خاتون مرحومہ کے لیے ایک بار سورۃ فاتحہ اور تین بار سورۃ توحید کی درخواست ہے۔

ملتمس محتاج دعا

خاکپائے اہل بیت علیہ السلام

خلیفہ سید حسن مہدی

26۔ ایبٹ روڈ لاہور

# مجلس اوّل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جَعَلۡنٰکَ عَلٰی شَرِیۡعَۃٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡهَا
(جاثیہ:۱۸)

ترجمہ: ہم نے تم کو دین کے کھلے رستہ پر قائم کر دیا ہے تو اسی رستہ پر چلو جاؤ۔

سرنامہ کلام قرار دیا ہے معنی ان جملوں کے یہ ہیں کہ خالق اپنے پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرما رہا ہے کہ ہم نے تم کو دین کے کھلے رستہ پر قائم کر دیا ہے تو اسی رستہ پر چلو جاؤ۔ اور آپ اس کی پیروی کیجئے۔ تمام دنیا میں تقریباً آدھی صدی سے یہ لہر ہے مختلف شکلیں ہیں اس کی کہ آئین اسلام اور شریعت اسلام کے نظام کو عملی حیثیت سے قائم ہونا چاہیے۔ اب ظاہر ہے کہ دنیا میں جو مختلف تحریکیں اس سلسلے میں ہوتی رہی ہیں ان کی تفصیل عرض کرنا یہ مجالس کے نظام کے تقاضے کے خلاف ہے۔ کوئی مستقل تصنیف اس موضوع پر ہو۔ اس ذیل میں تفصیل سے اُسے درج کیا جا سکتا ہے۔

تو یہ ایک لہر تمام دُنیا میں کسی نہ کسی شکل میں چل رہی ہے کہیں وہ با اقتدار طاقتوں کے مقابل کہ جس کو آجکل کی زبان میں حزبِ مخالفت کہتے ہیں۔ اس کی طرف سے یہ تحریک آتی رہی ہے زبان و قلم پر اور اس کے ذیل میں اس تحریک کے علم برداروں کو قید و بند بھی برداشت کرنا پڑی ہے اور دار و رسن سے بھی سابقہ ہوا ہے۔ مگر وہ طاقت کی تمام نمائشیں اور جبر و ضبط کی تمام کاروائیاں اس صدا کو ختم نہیں کر سکی ہیں۔ وقتی طور پر دبا دی جاتی ہیں کبھی ...... یہ اور بات ہے مگر ہر جگہ جہاں اس تحریک کے سلسلے میں سخت سے سخت دباؤ ڈالے گئے وہاں بھی تحریک ختم نہیں ہو سکی۔ بلکہ اس کے اثرات کسی نہ کسی حد تک پھیلتے رہے ہیں تو اس وقت بھی

بہت سے دنیا میں ایسے ممالک ہیں جہاں ارباب اقتدار اس کو پسند نہیں کرتے وہاں بھی کوئی ایک نہ ایک جماعت اس تحریک کی علمبردار موجود ہے۔

کہیں ان کی تعداد کم ہے کہیں زیادہ ہے...... کہیں زیادہ ان کے ساتھ تشدد ہے کہیں کم ہے۔ مگر یہ صدا دنیا میں ہے اور کہیں ممکن ہے کہ حالات نے ایسا پلٹا کھایا ہو کہ وہ خود جو اہل اقتدار ہیں وہ خود اس نظام کے قائم کرنے کے درپے ہو گئے ہوں اس سے بر عکس نہیں ہے وہ حقیقتاً اس نظام کے ساتھ خلوصِ دل سے خیر خواہی کی بناء پر ہیں یا کسی مصلحت کی بناء کے اوپر نمائشی طور پر ہیں۔

کیونکہ اس کا زیادہ تر تعلق نیتوں کے ساتھ ہے اور نیتوں کا جاننے والا عالم الغیب ہے۔ کسی دوسرے کو حق اس پر رائے زنی کا اس نے نہیں دیا ہے۔ کہیں وہ کلی طور پر نافذ کیے جانے کی منزل آ گئی ہو اور کہیں ممکن ہے کہ جزوی طور پر اس کے ایک ایک حصے کو لے کر اس کے نفاذ کرنے کی کوشش ہو رہی ہو۔ بہر حال یہ لہر اس وقت میں تمام دنیا میں ہے۔ میں نے عرض کیا کہ وہ بالکل نئی نہیں ہے بلکہ تقریباً آدھی صدی یا اس سے زیادہ سے وہ لہر آئی ہوئی ہے اور وہ ہوا چل رہی ہے۔

جس تناسب سے کہ وہ ہوا چل رہی ہے تو اسی تناسب سے اس کی مزاحم طاقتیں بھی کارفرما ہیں کبھی وہ باقاعدہ ٹکراؤ کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی مزاحم طاقتیں کچھ زیادہ سیاست دانی کا شعور دے کر براہِ راست ٹکراؤ نہیں کرتیں اور وہ یہ تحریک چل رہی ہے کہ شریعت اسلام میں ترمیم ہونا چاہیے اور گویا اسلامی خیر خواہی کا لباس پہن کے مسلمانوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ اپنے نظام کو تم بدل لو تا کہ ان کی دُور رس نگاہوں نے جس مستقبل کا اندازہ کر لیا ہے کہ یہ ہوا کبھی نہ کبھی دنیا پر چھا جائے گی تو اس کے لیے ابھی سے وہ اس کی کوشش میں ہیں کہ اگر نظام کارفرما ہو بھی جائے تو ہمارے مقصد کے لیے کم سے کم ضرر رساں ہو۔ لہٰذا اس کے لیے یہ مختلف تحریکیں دنیا بھر میں چل رہی ہیں۔ اب اس کی پوری صحیح

عمر میں نہیں بتا سکتا مگر وہ بھی اُبھر کر جب سے سامنے آئی ہیں۔ اسے بھی کوئی کم مدت نہیں گزری ہے بلکہ کافی مدت ہوگئی ہے کہ یہ شریعت اسلام اب اس میں مختلف صورتوں میں کہ اُس وقت کے حالات کے لحاظ سے یہ احکام تھے اور اب حالات میں تبدیلی ہوگئی ہے لہٰذا ان حالات کے تناسب سے شریعت اسلام رہنا چاہئے مگر حالات کی مطابقت کے لحاظ سے اُس کے احکام کو کارفرما ہونا چاہیے یہ ایک عجیب نظریہ ہے۔

اب بہت سی ایسی شخصیتیں سامنے ہیں اور پیش نظر ہیں کیونکہ کوئی مجھے کوئی ان کے خلاف کوئی ضرب نہیں لگانا ہے بلکہ ان کی جو تحریک ہے اس کو میں پیش کر رہا ہوں۔ لندن یونیورسٹی میں قانونِ اسلام کے پروفیسر ہیں اور فلسفہ واسلام کے ماہر مانے جاتے ہیں اور اب ممکن ہے کہ وہ اُن کے نام کا تلفظ چونکہ میری زبان کا نہیں ہے لہٰذا میں صحیح نہ کرسکوں اور پھر بھی اردو میں آکر کچھ تلفظ بدل ہی جاتا ہے وہ اصلی انگریزی تلفظ تو خالص اُردو دان آدمی نہیں کرتے۔ وہ وہی لوگ کرتے ہیں جن کو انگریزی دان ثابت ہونے کا شوق ہے تو اس لیے میں جس حد تک تلفظ کرسکتا ہوں وہ یہ کہ ان کا اسم گرامی ہے اینڈرسن صاحب۔ بہت مشہور شخصیت ہیں وہ اور اپنے حلقے میں گویا عالموں میں ہیں۔

تو وہ پروفیسر اینڈرسن صاحب جناب اس کے باوجود کہ نہ وہ مسلمان ہیں نہ وہ مدعی اسلام ہیں مگر جسے انہوں نے اپنی زندگی کی مہم بنایا ہوا ہے، جس کے لیے دورے کرتے ہیں جس کے لیے مختلف یونیورسٹیوں میں جا کر لیکچر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ سمجھانے کے لیے کہ شریعت اسلام میں ترمیم ہونا چاہیے اور فلسفہ واسلام کے ماہر مانے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی رائے کو لوگ وقیع سمجھتے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ اگر اسلام سے یہ ایسے ہی مخلص ہیں تو اب تک کسی غیر جماعت میں شامل کیوں ہیں چنانچہ وہ حضرات کہ جو لندن یونیورسٹیوں میں گئے ہیں یا وہاں تعلیم پائی ہے یا وہاں جو واقف ہیں۔ مختلف وجوہ سے وہ تو براہ راست ان سے متعارف ہوں ہی گے۔ میں ایسی دُنیا کا آدمی ہوں کہ مجھے وجہ ہی نہیں تھی کہ ان سے

خاص طور پر متعارف ہونے کی لیکن وہ یہاں ہندوستان تشریف لائے اور انہوں نے علی گڑھ آنے کا پروگرام بھی بنایا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لیکچر ان کا قرار پایا۔

اُس زمانے میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب تھے تو دہلی میں وہ جب اُن سے ملے تو انہوں نے میرا نام دے دیا کہ علی گڑھ جایئے گا تو فلاں شخص سے ضرور ملاقات کیجئے گا۔ تو انہوں نے نام سن کر محفوظ کر لیا اور علی گڑھ میں جس وقت سے وہ آئے تو انہوں نے میرا نام لے کر پوچھنا شروع کر دیا کہ وہ کیونکر ملیں گے اور کہاں ملیں گے اور کیا ہوگا۔

چونکہ وہ قانونِ اسلام کے پروفیسر ہیں تو بقانونِ ہم جنسی ہمارے ہاں لاء کے شعبے میں یونیورسٹی میں ان کا لیکچر قرار پایا تو اب لاء کے جو چیئرمین تھے ڈاکٹر یوسف الرحمٰن صاحب انہوں نے مجھے ایک خط لکھا کہ صاحب وہ اینڈرسن صاحب آئے ہیں اور وہ جس وقت سے یہاں آئے ہیں بس آپ ہی کو پوچھ رہے ہیں۔ لہٰذا سہ پہر کو جو عصرانہ ان کے اعزاز میں ہے۔ اس میں آپ ضرور شریک ہوں تا کہ وہیں ملاقات ہو جائے اور اسی سے تقریب ملاقات ہو جائے۔ تو وقت مثلاً ملاقات بہ اطمینانی وہیں طے ہو جائے گا تو اس لیے وہاں آیئے۔

چنانچہ میں گیا تو پہلے مجھے یہ فکر تھی کہ میرے اور اُن کے درمیان مشترک زبان کون ہو گی جس میں گفتگو ہو سکے۔ کیونکہ میں انگریزی سے ناواقف...... اور وہ اُردو سے ناواقف ہوں گے تو ہم میں تفاہم کیونکر ہوگا۔ مگر جا کر یہ مشکل حل ہوگئی۔ جیسا کہ وہ بقدرِ ضرورت عربی بول سکتے ہیں اور وہ مصر وغیرہ میں کافی رہے ہیں۔ اس بناء کے اوپر عربی ہمارے اور اُن کے درمیان مشترک ذریعہ تفاہم بن گئی تو پہلے ہی جب میں پہنچا اور تعارف ہوا تو انہوں نے پہلے ہی کہا کہ آپ کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ایک طبقے نے یہ اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ لہٰذا ان کے ہاں کم گنجائش ہے اور آپ کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے لہٰذا ہم یہ امید کرتے ہیں کہ ہمارے مقصد میں آپ سے بہت زیادہ مدد ملے گی۔ تو اب

یہ چیز جو عام زبان میں گویا معیارِ اخلاق کے خلاف ہو۔ مگر میں اس اخلاق کو بد اخلاقی سمجھتا ہو۔ جس میں کسی کو تاریکی میں رکھا جائے۔ میں اس اخلاق کا قائل نہیں ہوں اسی لے بد اخلاق مشہور ہوں۔ تو حضور میں نے اُسی وقت چاہا کہ ان کو مایوس کر دوں کیونکہ انہوں نے کہا کہ ہمیں آپ سے امید ہے اس لیے کہ آپ کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے تو میں نے کہا کہ جی ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے مگر دین میں ایجاد کا دروازہ نہیں کھلا ہوا۔

تو اُس وقت میں سمجھتا ہوں کہ پوری مکمل گفتگو اُسی وقت ہو گئی اس ایک جملے میں اس کے بعد ان سے ملے پایا کہ جس طرف ان کا قیام تھا۔ میں نے کہا کہ میں آجاؤں گا۔ آپ مہمان ہیں اور وہیں ملاقات کا پیشگی طے ہو گیا دوسرے دن چار بجے کہ وہ وہیں ہونگے۔

اور جب اس کے بعد تھوڑی دیر میں تقریر کا وقت آیا تو وہاں مجھ سے بھی انہوں نے کہا کہ آپ پہل کیجئے تو میں کیا کہتا۔ انہوں نے کہا یہ بدعت تو نہیں ہے یہ گویا ضرب تھی۔ اس حد تک ملائیت کو کہ یہ بدعت تو نہیں ہے میں نے کہا کہ جی اگر یہ معیار بدعت کا ہو تو میں خود بھی بدعت ہوں۔ یہ بدعت کیا ہے؟ تو صاحب یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اب ایک جملے میں اس وقت یہ طے ہو گیا۔ اب بھی انشاء اللہ ممکن ہے کہ کسی مجلس میں وہ مستقل موضوع پوری مجلس کا ہو جائے مسئلہ بدعت تو کیونکہ یہ بھی زندہ موضوعات میں سے ہے۔ بہر حال اُس وقت...... اب اس کے بعد ان سے اُن سے گفتگو ہوئی اور وہ گفتگو...... بے نتیجہ ختم ہوئی۔ کیونکہ بیچ میں بالکل مذہبی گفتگو ہونے لگی اور مسئلہ تحریف بھی آ گیا لہٰذا کچھ نتیجہ خیز گفتگو آخر میں نہیں ہوئی اور بڑی تنقیدیت (خرابی) اس میں پیدا ہو گئی۔

تو بہر حال...... انہوں نے اپنی زندگی کی مہم یہ قرار دی ہے۔ اب ظاہر کہ اینڈرسن صاحب مبلغ ہو جائیں ترمیم اسلام کے۔ تو کیا کہنا۔ جو ایمان لائے ہوئے ہیں ان کی خیر خواہی پر...... وہ اس کوشش کو بھی خیر خواہانہ سمجھ سکتے ہیں اور اس کے بعد۔ اب اور بھی شخصیتیں ہوں گی۔ مجھے تو معلوم نہیں ہے مگر ایک بہت قابل شخص...... بہت پڑھے لکھے مانے جاتے

ہیں اور غالباً مجھے پوری طرح سے علم نہیں ہے کہ وہ...... مگر خیر تصور ہے کہ انتقال ہو چکا ہے۔ فیضی صاحب پروفیسر فیضی صاحب وہ ہمارے اسمٰعیلی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور ایک وقت میں وہ ہمارے ہاں کے وائس چانسلر بھی ہونے والے تھے مگر وہ (بات) وہیں ختم ہو گئی تو وہ پروفیسر فیضی صاحب اُن کی تصانیف بھی ہیں اس موضوع پر بہت سی تقریریں بھی ہیں اور آجکل جو ہمارے ہاں نائب صدر جمہوریہ ہیں اور اس وقت وہ قائم مقام کی حیثیت سے ہیں۔ بدل صدر ہیں اعجاز اللہ صاحب یہ بھی اس کے علم بردار رہے ہیں تو یہ بھی ایک عہد ہے کہ یہ ایک تحریک چلتی رہی ہے۔

جس تناسب سے اس میں زیادہ قوت ہوگی ظاہر ہے اسی تناسب سے اس تحریک میں بھی قوت پیدا ہوگی۔ تو اب یہ آیت جسے میں نے سرنامہ کلام قرار دیا ہے۔ اس کو سرنامہ بنانے کی وجہ اور جو چیز کہ عرض کرنا ہے اور اسی کے تحت میں جو بعد میں بیان ہوں گے۔

یہ آئین جس کا نام "شریعت" یہ وضع کیا ہوا کس کا ہے؟ جسے ہر شخص چاہے قانون کی روشنی میں بھی اور عقل۔ عام عقل کی روشنی میں بھی سمجھ سکتا ہے کہ جسے وضع قانون کا حق ہو۔ اسی کو ترمیم قانون کا بھی حق ہے یہ بالکل کسی بھی اصول پر منطبق نہیں ہے کہ وضع کرنا کسی کا کام ہو اور ترمیم کرنا کسی اور کے ہاتھ میں ہو جسے حق ہوگا وضع قانون کا۔ اسی کو حق ہے ترمیم کا اور ترمیم ظاہر ہے کہ بلاوجہ نہیں کرے گا۔

اب اگر وضع قانون کرنے والا غلطی سے بری نہیں ہے تو ترمیم بھی وہ اپنی غلطی کے حساب سے کرے گا اور اگر وہ غلطیوں سے بری ہے تو اس کے نقطہ نظر سے اگر وہ ترمیم کرے گا۔ تو غلطی کے احساس سے نہیں ہو سکتا کیونکہ جو غلطیوں سے بری ہو تو پھر اس کے ہاں غلطی کا سوال کیا...... پھر اب اگر وہ تبدیل کرے گا تو حالات کی تبدیلی سے ایسا کرے گا۔ تو بہر حال حق اسی کو ہوگا ترمیم کا کسی دوسرے کو حق نہیں ہو سکتا کہ وضع قانون کا حق تو نہ ہو اور ترمیم قانون کا حق ہو۔ یہ کوئی اصول نہ کسی قانون کے لحاظ سے درست ہے نہ عقل ذوقی کے

تقاضوں کے لحاظ سے صحیح ہے۔

تو اب میں جب قرآن مجید پر نظر ڈالتا ہوں اور اس کی ایک مختصر سی آیت کو میں نے سرنامہ کلام یہاں قرار دیا ہے۔ تو یہ دیکھتا ہوں کہ قانونِ اسلام جس کا نام شریعت ہے۔ اس قانون کے وضع کا حق خود رسولؐ کو بھی نہیں دیا گیا ہے یعنی کوئی بشر یہاں بتقاضہ اسلام وایمان واضع قانون نہیں مانا جاسکتا کوئی بشر...... بلکہ جو خالقِ بشر ہے پروردگار عالم، وہی واضع قانون ہے اور اس لیے پیغمبر سے بھی کہا یہ جارہا ہے کہ ہم نے آپ کو ایک قانونِ حیات پر چلایا ہے تو آپ اس کی پیروی کیجئے اس کے معنی یہ ہیں کہ پیامبر بھی متبع قانون ہیں موجد قانون نہیں کہا گیا ہم نے...... یہ ہم کون بھئی؟ کس نے کہا؟ کہ اِنَّا اَرۡسَلۡنٰکَ ہم نے آپ کو بھیجا۔ وہی جس نے کہا۔ انا نحن نزّلنا القران۔ ہم نے یہ قرآن اتارا، حالانکہ قرآنِ مجید میں بہت سی جگہ...... میں کہا گیا اور ہمارے نزدیک ''میں'' کہنا شرک کے شابے کے دور کرنے کے لیے زیادہ مناسب لفظ تھا اور اسی وجہ سے کم سے کم میں جس جماعت سے متعلق ہوں ہم نے تقاضائے توحید کے تحفظ کیلئے اپنے عام آداب وتہذیب کے قواعد کو بھی نظر انداز کردیا ہے اس کے تخاطب میں ہم ''تو'' ہی کہیں گے۔ آپ نہیں کہیں گے کیونکہ تم اور آپ میں شرکت غیر کا شائبہ ہے۔ مگر ''اُس'' کہنے میں اور ''تو'' کہنے میں...... ہم کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ خالق کریم فرماتے ہیں کیا وہ بہت سے ہیں جو فرماتے ہیں۔ تو وہی لفظ استعمال کریں گے کہ جس میں وحدت یقینی ہو اور وہ وہی ''تو'' ہے اور وہی وہ کہتا ہے اور وہ آتا ہے۔ ہم یہاں تہذیب کے تقاضوں کو اصول پر قربان کردیتے ہیں۔

تو میں اپنے آدابِ گفتگو میں اتنا اس ''حفظ وحدت'' کا تعرض کروں تو وہ خود اپنے لیے کیوں نہ اس کا تحفظ کرے گا۔ تو ''میں'' کیوں نہ کہے وہ ''ہم'' کیوں کہے مگر یاد رکھیے کہ ہر سخن موقع وہر نکتہ مقام رکھتا ہے۔

جہاں وحدت کو نمایاں کرنا ہوا ہے۔ وہاں ''میں'' ہی کہا گیا ہے۔ میں اللہ ہوں۔

وہاں ''ہم'' نہیں کہا گیا ہے۔ اِنِّی اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ (طٰہٰ۔۱۲) اے موسیٰ میں تمہارا پروردگار ہوں۔

وہاں وحدت کو نمایاں کرتا ہوا ہے کیونکہ ربوبیت کو ثابت کرتا ہے وہاں ''ہم'' نہیں کہا گیا ہے۔'میں' کہا گیا ہے اور جہاں قوتِ عمل کا اظہار منظور ہوا ہے وہاں ''میں'' نہیں کہا گیا ہے ''ہم'' کہا گیا ہے۔قوتِ عمل کا اظہار کرنے کے لیے اور اس ہم میں مخالف طاقتوں کو چیلنج مضمر ہوتا ہے۔انا نحن نزلنا الذکرا وانا لہ لحافظون ○ (حجرہ:9) ہم نے قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں یعنی لاکھ دنیا ترتیب کو بدل ڈالے لیکن مٹا نہیں سکتی۔ اس کے اعجاز کو ختم نہیں کر سکتی۔ اس کی حقانیت کو فنا نہیں کر سکتی اور پھر اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ۔ہم نے آپ کو کثرتِ نسل عطا کی ہے۔یعنی اب اموی اور عباسی سلطنتیں اپنی پوری طاقت صرف کردیں لیکن اس نسل کو کیونکر ختم کر سکیں گی۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (الم نشرح:4) اور اسی ذیل میں اے رسولؐ ہم نے آپ کے ذکر کو اونچا کیا ہے اب لاکھ بدعت کے فتویٰ لگتے رہیں۔اس میں ترمیم نہیں ہوگی......تو اسی 'ہم'' کے ساتھ اور آپ کی اُردو زبان کے محاورے کے لحاظ سے کہوں کہ اسی ''ہم'' کی ہماہمی کے ساتھ یہ کہا جارہا ہے کہ ہم نے آپ کو ایک قانون کا پابند بنایا ہے اب اسی ''ہم'' میں یہ مضمر ہے کہ کون اس میں ترمیم کرسکتا ہے کون اس کو بدل سکتا ہے چنانچہ اب میں نے پہلے ہی عرض کردیا تھا کہ ان دنوں آئندہ کی مجلسوں میں تفصیلات تو پھر عرض ہوں گے کہ خود رسولؐ سے فرمائشیں کی جاتی تھی کہ اس کو کچھ بدل دیجئے اور کچھ ہمارے مطلب کی باتیں آجائیں۔قرآن مجید میں اس کا تذکرہ ہے کہ:وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا (یونس:15) اور ہماری آیتیں پڑھ دیجئے۔جب اُن کے سامنے پیش ہوتی ہیں۔

جو لوگ کہ ہم میں منہ دکھائے کا تصور نہیں رکھتے وہ رسولؐ سے کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ رسولؐ کے وقت حاضر نہ ہوتے تو کیسے کہتے تو یہ رسولؐ سے کہتے ہیں کہ یہ قرآن جو

آپؐ نے پڑھا ہے اس کے سوا کچھ اور پڑھنے اور تبدیلی ہو جائے گی اس میں تھوڑی سی اس میں ردوبدل کر دیجئے تو اب اس کے جواب میں رسول کی زبان میں گویا بے بسی کا اظہار کیا گیا ہے کہ "قل" کہہ دیجئے "انما اتبع ما یوحی الی"۔

میں تو اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے اوپر نازل ہوا ہوا ہے۔ قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلْقَآئِ نَفْسِيٓ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ (یونس:15) میرے لیے یہ کہاں حق ہے۔ اعلان حق ہو رہا ہے ما یکون لی میرے لیے یہ حق نہیں ہے مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں اس میں تبدیلی کر دوں...... اپنی طرف سے...... ان اتبع الا ما یوحی الی۔ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں۔ جو میرے اوپر وحی ہوئی ہے۔

تو معلوم ہوا کہ نہ وضع قانون کا انہیں حق نہ ترمیم وتبدیل قانون کا انہیں حق اور غور کیجئے اور قرآنی مطالعہ ہے اگر کیجئے اپنی جگہ اور اس سے مطلب نہیں۔ قرآنی مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ یہی چیز اُس وقت اسلام اور کفر میں حد فاصل تھی یعنی قرآن کو غیر معمولی کلام سمجھتے ہوئے بھی یہ چیز حد فاصل تھی اسلام اور کفر میں کہ دُنیا اسے کلام رسول کہتی تھی اور اسلام اسے کلام خدا منواتا تھا۔ اگر کلام رسولؐ کہتے رہیں تب تک کفر...... اور جب کلام خدا مان لیں تب اسلام۔ تو نہ قرآن کلامِ خدا ہونے کے سوا کوئی اور کہ وہ کلام بشر...... کلام بشر سمجھیں اور بشر کون...... جس بشر کو سامنے وہ دیکھ رہے تھے یعنی نبی...... زبان سے تو اُسی کی سن رہے تھے مشاہدے پہ ایمان رکھتے تو انہی کا کلام مانتے رہتے۔ لیکن اسلام کا پہلے ہی قطعاً اس کا مطالبہ تھا کہ دیکھو کچھ اور مانو کچھ اور یہ الوہی حقیقت ہے ہمیشہ دنیا والوں کے لیے یہ ایمان بالغیب کی منزل بہت مشکل رہی۔

مشاہدے پر ایمان رہتا تو کلام رسولؐ سمجھتے رہتے مگر دیکھو رسولؐ کی زبان سے سنو اور مانو خدا کا کلام...... جو دیکھو اسے نہ مانو۔ جو نہیں دیکھا ہے اُسے مانو۔ تو قرآن واسلام کا ہر قدم پر مطالعہ غیب پر ایمان کا ہے خدا کو مانو تو بے دیکھے مانو۔ رسول کو مانو بے دیکھے مانو۔ کوئی

کہے کہ رسولؐ کہ اس کو دیکھ کر مانا ہے ہم نے نہ سہی۔ اُس نے اُس وقت مانا ہے اُس نے تو دیکھ کر مانا ہے۔

میں نے کہا کہ جسے دیکھا تو اگر دیکھنے پر بس ایمان رکھتے تو تو بس چہرہ ایسا ہے۔ یہی سمجھتے رہتے۔ زلفیں ایسی ہیں۔ یہی سمجھتے رہتے مگر اس سے اسلام نہ ہوتا۔ اسلام ہوتا یہ سمجھ کر کہ یہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ صرف رخ پر ایمان لانا نہیں تھا رسالت پر ایمان لانا تھا۔

اگر رسالت پر ایمان لائے یعنی بھیجے ہوئے تو کس کے بھیجے ہوئے۔ جب بھیجنے والا نہیں دیکھا۔ تو بھیجنا کب دیکھا تو اس کے معنی یہ کہ رسالت بھی مشاہدے کے ماننے سے نہیں ہوتی۔ غیب کے ماننے سے ہوتی ہے اور قیامت پر ایمان لائے تو کیا دیکھ کے ایمان لائے؟ اگر دیکھ لیتے تو قیامت ہی نہ ہو جاتی تو قیامت اور قیامت کے ساتھ پوری کارگاہِ قیامت حشر و نشر مانا اور حساب و کتاب مانا اور نامہ اعمال مانا اور صراط مانا اور میزان مانا اور کیا کیا مانا بے دیکھے ہوئے۔ بس میں خیر خواہانہ مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ اتنی منزلیں بے دیکھے مان لیں۔ تو اب ایک منزل پر اپنے ایمان کو کیوں خطرے میں ڈالتے ہو۔

یاد رکھیے کہ یہ کلام کلام نبی نہیں کلام خدا ہے۔ یہ پیام پیام نبی نہیں...... پیام خدا ہے...... تو یہ آئین بھی آئین نبی نہیں...... آئین خدا ہے...... یہ نظام بھی نظام نبی نہیں...... نظامِ خدا ہے...... بھئی اسی ذرا سے مقابلے کے فرق سے، ذرا اسی نسبت کے فرق سے...... فرق پیدا ہو جائے گا۔ کہ اگر نبی گا کلام مانا...... نبی کا پیام مانا...... نبی کا نظام مانا اور نبی کو یہ مانا کہ یہ ہمارے جیسے بشر۔ تو ہم بھی ان کے جیسے بشر...... وہ ہمارے ایسے بشر...... ہم ان کے جیسے بشر۔ لہٰذا ان کو قانون بنانے کا حق تھا۔ ہمیں قانون مٹانے کا حق ہے۔ اور اگر یہ معلوم ہو کہ نہیں یہ آئین بھی آئین خدا...... کلام بھی کلامِ خدا...... پیام بھی پیام خدا...... تو اب ہم میں سے کوئی خدا ہونے کا دعویٰ دار نہیں ہے۔ لہٰذا ترمیم کا تصرف بھی ہر کسی کو نہیں ہو سکتا۔ بس اس چیز کو پیش نظر رکھنا ہے کہ کلام کس کا ہے...... پیام کس کا ہے...... پیغام کس کا ہے...... آئین

کس کا ہے...... نظام کس کا ہے...... دین جس کا ہے...... شریعت بھی اسی کی ہے۔

جب شریعت بھی اُسی کی طرف کی ہے تو اس میں ترمیم کرنے کا حق نہیں ہے اسی وجہ سے، مگر دنیا فہمی میں دوسروں کی چیزوں کو وہ اپنا لیتے ہیں کبھی ذوق تقلید سے اور کبھی مرعوبیت ہے۔ چنانچہ دین یہ بھی کہ مستقل چیز ہے جو ضمناً آ گئی ہے کہ دنیا والوں کے ہاں چونکہ دین موسوی تھا۔ دین عیسوی تھا تو لوگوں نے اسلام کا نام رکھ دیا۔ دین محمدی اب آپ انگریزی میں اسے کہہ لیجئے۔ مگر یاد رکھیے کہ خود رہنمایانِ اسلام نے۔ خود پیغمبر اسلام نے بھی اس دین کا تعارف ''دین محمدی'' کہہ کر نہیں کرایا ہے یہ غیروں کی بات ہے جسے نادانستہ اپنوں نے لے لیا ہے۔

اس کا نام تو اسلام ہے اور اسلام جس کے سامنے...... اللہ کے لیے اسلام قائم ہے جو آسمان و زمین میں ہے۔ لہٰذا دین وہ دین محمدی کیا ہے۔ وہ دین آدم بھی تھا۔ وہ دین نوح بھی تھا۔ وہ دین ابراہیم بھی تھا۔ مگر اس معنی سے کہ یہ سب مبلغ دین تھے اور اصل دین کس کا ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔ (آل عمران:19) اللہ کے ہاں جو دین ہے وہ اسلام ہے۔ تو اس طرح سے ہے کہ یہ آئین بھی۔ رسولؐ مبلغ قانون ہیں واضع قانون نہیں ہیں رسولؐ کے ذریعے سے یہ شریعت پہنچی ہے۔ خود رسولؐ نے اس شریعت کو وضع نہیں کیا ہے اور نہیں تو بہت سی باتیں کہی جا رہی ہیں تفصیلات تو بعد میں آئیں گی۔ مگر ایسے ہی ضمناً اور آخر کلام سمجھنا چاہیے کہ یہی ہے یہ تصور ہے جناب کہ بدلے ہوئے حالات چودہ سو برس سے اور اس میں وہی سا قانون آج تک چلتا رہے تو دُنیا بدل رہی ہے تو قانون میں بھی تبدیلیاں ہونا چاہئیں۔ یہ کیسے کہ جو تبدیلیاں ہوں اور پھر قانون وہی ایک رہے اور اسے کہیے کہ یہ نہیں۔ یہ نہیں بدل سکتا کبھی۔

اب اس کے لیے بس ایک مختصر واقعہ اور اس کے ساتھ یادش بخیر، وہ یہیں کراچی میں موجود ہیں اگرچہ دو برس سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ خدا کرے وہ صحیح و سلامت

ہوں۔ تو جناب اشفاق حسین صاحب بیرسٹر جن کے بھائی اخلاق حسین صاحب بیرسٹر وہاں دہلی میں تھے۔ اب ان کے بھائی اشفاق حسین صاحب بیرسٹر یہ شروع ہی سے ہمارے بہت ہی دوستوں میں اور جاننے والوں میں رہے اور مولانا آزاد کے ساتھ جب وہ وزیر تعلیم تھے۔ تو ان کے سیکرٹری تھے ان کی وزارت میں ان کے یہاں کہ ایک وہ کیا ہے کہ یہ سب خیر میں سمجھتا ہوں اصطلاحی حکومت کی باتیں ہیں میں واقف نہیں ہوں لیکن خیر وہ سیکرٹری تھے بس اس طرح تعلیم کے محکمے میں یہ معلوم ہے۔

تو میں اس زمانے میں جب اٹھائیس برس پہلے پاکستان آیا کرتا تھا تب یہیں پاکستانی ویزا کے مراحل طے کرنا ہوتے تھے...... اچھا تو میں ان ہی کے ہاں قیام کرتا تھا کیونکہ نئی دہلی میں ان کے وہاں سے سفارت خانے وغیرہ قریب تھے۔ لہٰذا اُن کے وہاں جانا نہیں ہوتا تھا۔ وہ خود ہی اسے کرا دیا کرتے تھے تو ان کے ہاں قیام میں کرتا تھا اشفاق صاحب تو صاحب وہ بہر حال معلوم ہے اشفاق حسین صاحب کہ ان کا...... خدا کرے وہ صحیح وسالم ہوں مگر اب جس کا نام لیتا ہوں ان کا تو معلوم ہے کہ اس دُنیا سے رخصت ہو چکے یعنی جوش صاحب ملیح آبادی جو شاعر انقلاب ہیں تو یہ لکھنؤ میں جب جاتے تھے۔ یہ بہت سے لوگوں کو حیرت ہوگی۔ تعجب ہوگا اس خبر کو سن کر کہ وہ جب بھی لکھنؤ جاتے تھے تو مجھ سے ضرور ملتے تھے۔ اب یہاں ان کے حالات کو نہیں پیش کرنا ہے نہ ہی بیان کرنا ہے تو ان کے بڑے دوستوں میں تھے۔ جیسے یہاں حکیم عالم صاحب بڑے ہی دوستوں میں تھے۔ تو وہاں وہ میری موجودگی میں جب میں تھا تو اشفاق حسین صاحب کے پاس ملاقات ہوا کرتی تھی تو ایک روز انہوں نے میری موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اپنے بنگلے کے اوپر ایک مجلس قائم کر دی اس مجلس کے لیے نہ کوئی دعوت نامہ تھا۔ نہ اشتہار و اعلان تھا۔ نہ اخبار میں اس کا اعلان تھا۔ بلکہ ٹیلی فون کے اوپر انہوں نے ایسے ایسے لوگوں کو گویا کہ اطلاع دی۔ جو کبھی عمر بھر میں مجلس میں نہ شریک ہوئے ہوں تو وہ صرف ان کے تعلقات اور ان کے ذوق کی بناء پر انتخاب تھا

مدعوئین......اور کوئی بڑی جگہ بھی نہ تھی کمرہ اُن کا جتنا تھا......اسی میں مجلس منعقد تھی...... وہ مجھ سے وعدہ لے چکے تھے کہ کل سہ پہر چار بجے مجلس ہوگی اس کا اقرار اب وہ اتفاق سے اس سے پہلے صبح کے وقت وہ ادھر آ گئے جوش صاحب۔تو ساتھ جو ملاقات کا کمرہ تھا۔وہاں ان کی نشست تھی۔اب مجھے معلوم ہوا کہ جوش صاحب آئے ہیں تو کیونکہ وہ میرے پاس وہ آتے ہی رہتے تھے تو میں بھی باہر آ گیا۔تو انہوں نے ہمارے بیرسٹر صاحب نے اُن سے کہا کہ بھئی ہمارے ہاں مجلس ہے چار بجے اور اس میں تم بھی آؤ۔تو ظاہر ہے کہ بے تکلفی کے ساتھ اُن سے گفتگو ہوتی تھی۔تو "تم بھی اس میں آؤ" اب انہوں نے کہا کہ میں اس وقت کچھ ایسی مصروفیتیں ہوتی ہیں کہ میں عموماً گھر سے نکلا نہیں کرتا ہوں۔لیکن جس موضوع پر میں کہوں اگر اس پر بیان ہو۔تو پھر میں کچھ اپنے نظامِ عمل میں تبدیلی کرلوں گا......اور پھر میں آؤں گا۔

انہوں نے بالکل ایمان بالغیب کے طور پر کہہ دیا۔منظور نہ مجھ سے منظوری حاصل کی۔نہ ان سے موضوع پوچھا۔تبھی میں ایمان بالغیب کہہ رہا ہوں۔تو جناب یونہی آنکھ بند کر کے انہوں نے کہہ دیا کہ منظور۔موضوع بتائیے۔کس موضوع پر تو وہ موضوع بھی میری اس موضوع مجلس سے تعلق رکھتا ہے۔اب اُسے تفصیل سے نہیں پیش کرنا ہے۔کیونکہ وقت ہو چکا ہے پورا۔حالانکہ عام مجلسی زبان میں میں نے ابھی کچھ بیان نہیں کیا ہے جو مجلس کے زمرے میں آتے ہیں تو وہ ابھی کچھ بھی بیان نہیں کیا ہے یہ آپ کا ذوق سماعت ہے اور میرے ساتھ مظاہرہ اخلاق ہے کہ آپ ایسی غیر مجلسی باتوں کے اوپر بھی محظوظ ہوتے ہیں۔

تو جناب وہ انہوں نے کہا کہ منظور تو انہوں نے کہا کہ اس پر بیان ہو کہ "کیا اس بدلتی ہوئی دنیا میں کوئی چیز ایسی ہو سکتی ہے جو تبدیل نہ ہو"؟ اب اس کے بیان السطور میں تو یہی سب ہے کہ دین کو ناقابل ترمیم کہا جاتا ہے اور یہ نکتہ ہے کہ:

"کیا اس بدلتی ہوئی دنیا میں کوئی چیز ایسی ہو سکتی ہے جو تبدیل نہ ہو۔"

اس پر بیان ہو۔ پھر انہوں نے مجھ سے نہیں پوچھا۔ ایجاب وقبول مکمل بالکل نہیں ہوا اور بصد ناز انہوں نے کہہ دیا کہ منظور...... اور ہم کو گویا معلوم ہو گیا کہ ہمیں اس پر بیان کرنا ہے۔ چنانچہ صاحب وہ وقت معین سے پہلے وہ آگئے اور مجلس میں ظاہر ہے ہر طرح کی قوم و ملت کے افراد جو چنے ہوئے منتخب۔ انہوں نے ٹیلی فون پر جنہیں مدعو کیا تھا۔ وہ سب آگئے اور اس مجلس میں پہلی بار اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔

تو اب اس مجلس کے پورے طور مضامین تک یاد ہیں کہ کیا کیا بیان ہوا تھا۔ تو جناب وہ جوش صاحب اس طرح سے بیٹھے تھے۔ منبر تو تھا نہیں' کرسی تھی وہ کرسی ظاہر ہے قائم مقام منبر ہوتی ہے تو منبر کی جتنی چوڑائی تھی وہ سب اُنہیں سے پُر تھی تو یعنی اب درمیان میں کوئی اور گنجائش زیرِ منبر نہیں تھی۔ گویا بلا فاصلہ اُن سے۔ وہ بیٹھے تھے بس اتنا فرق کہ میں کرسی پر اور وہ کرسی کے نیچے اور وہ گویا پلتی مار کے انہوں نے نشست کی اپنے پیرانہ انداز میں تو پوری کرسی...... بن گئی ان کے ذریعے سے تو میں نے جو شروع کیا تو نظریں انہوں نے مجھ پر گھڑ دیں اور ظاہر ہے کہ اُنکی حدِ نظر میں ایک میں ہی تھا۔ لہٰذا میں ان کی نگاہ کی پوری زد کے اوپر تھا اور میں نے آیت شروع کی: فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (روم:30)

اللہ کی فطرت کے تقاضے ہیں جس پر اُس نے اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی فطرت کے تقاضوں میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

اُن کی نگاہوں کی زد پر تھا میں بلا فاصلہ اور میرے موضوع کی زد پر تھے وہ بلا فاصلہ اور اس کے بعد میں نے بیان کرنا شروع کیا اور بس دس منٹ کے بعد میں نے ان کی طرف دیکھا اور ظاہر ہے کہ مجھ کو تو بتقاضہ خطابت دُور تک بھی دیکھنا تھا اور وہ مجھ ہی کو دیکھ رہے تھے مگر میں اوروں کو بھی۔ دیکھنا مجھے ضروری تھا مگر ہر پانچ منٹ دس منٹ تقریر کے بعد میں ان کی طرف دیکھتا تھا اور جونہی میں ان کی طرف دیکھتا تھا۔ تو وہ فوراً یہ کہتے تھے کہ ابھی تک کوئی

اختلاف نہیں ہے...... ابھی تک تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور جناب پون گھنٹے تقریباً میرا بیان ہوا۔ کیونکہ اِس مجلس میں اب اس سے زیادہ گنجائش تھوڑی تھی۔ جیسا کہ ماشااللہ یہاں کی مجلس کا بیان ہوتا ہے۔ تو پون گھنٹے بیان ہوا اور وہ۔ کوئی نکتۂ اختلاف کا آیا ہی نہیں۔

یعنی جو بات میں کہہ رہا تھا۔ وہ ان کے دل کے اندر کی تھی اور اتفاق سے مصائب بھی میں نے جو بیان کیے اب ظاہر ہے کہ اس وقت وہ مصائب تو عرض نہیں کرنا ہیں اور اب بہر حال تمہید تو ختم ہوگئی۔ آؤں گا تو مصائب ہی پر لیکن یہ کہ وہ اس وقت بیان کیا تھا اُس وقت بیان نہیں کرنا ہے کہ مصائب میں اب اُس جگہ ہر قوم وملت کے افراد مجھے تو پتہ نہیں لہٰذا جو عرض کرنا تھا بقدرِ امکان لہٰذا شہادتِ جناب علی اکبرؑ آخر میں میں نے بیان کی اور اس میں جتنے شرکاء تھے بھی متاثر ہوئے اور آخر میں میں نے یہ جملہ کہا کہ بتایئے بدلتی ہوئی دنیا میں کون دور ایسا آسکتا ہے جو اس سے متاثر نہ ہو۔ بدلتی ہوئی دنیا میں کوئی بھی ایسی تبدیلی ہو سکتی ہے کہ دُنیا اس دردناک مصیبت سے متاثر نہ ہو اور مجھے عموماً اشعار نہیں یاد رہتے مگر اُس وقت مجھے بتقاضہ و موضوع یاد آ گیا۔ میں نے کہا کہ یہی واقعہ کربلا کی خصوصیات ہیں جن کی بناء پر شاعر انقلاب کو بھی...... موضوع اب میرے مطلب کا تھا۔ لہٰذا میں نے کہا کہ یہی خصوصیات ہیں۔ واقعہ کربلا کی۔ جس کی بنا پر شاعر انقلاب کو بھی کہنا پڑا۔ سننے والے بہت سوں کو وہ یاد ہوگا اور مجھے یاد تو تھا۔ مگر اس وقت پہلا مصرعہ پورا یاد نہیں آرہا ہے کہ۔ کہارہ جائے گا پہلا مصرعہ یاد نہیں...... بس فقط نام

موت کے سیلاب میں ہر خشک و تر بہہ جائے گا
بس فقط نام حسینؑ ابن علیؑ رہ جائے گا

بس اس کے بعد میں نے یہ جملہ کہا کہ معلوم ہوا کہ اس بدلتی ہوئی دنیا میں بھی کچھ حقیقتیں ہیں جو نہیں بدلتیں۔ سو حقیقت یہ ہے اب عرض نہیں کرنا ہے کہ شریعت اسلام کی بقا میں سب سے بڑا راز یہی مضمر ہے کہ جو فطرت کے تقاضے ہوں۔ وہ نہیں بدلا کرتے۔ لہٰذا وہ

قانون بدل جائیں گے جو فطرت کے تقاضوں کے خلاف ہیں اور جو قانون زیادہ سے زیادہ فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ وہی ناقابل تبدیل ہوگا اور بس ارباب عزا اب آج تو پہلی تاریخ محرم کی ہوگئی ہے اور الحمد للہ کہ بلا اختلاف کہ چاند کے مسئلے میں کوئی دو رائے نہیں ہوئیں اور آج پہلی تاریخ محرم کی ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ یوں تو سال بھر عزائے حسین رہتی ہے اب مجھے تو اپنے یہاں کا حال معلوم ہے یہاں بھی میرا خیال ہیں مومنین کے گھروں میں ایک گوشہ ہوتا ہے کہ جسے مستقل عزا خانہ سمجھا جاتا ہے اور وہاں پردہ بڑا رہتا ہے اور وہ روز مجلس کھلتا ہے تو وہ عزا خانہ مستقل رہتا ہے لہٰذا سال بھر مجالس بھی ہوتی ہیں اور سال بھر مختلف اوقات میں کبھی کبھی علم بھی اٹھتے ہیں۔ مگر جو بات ایام عزا کی ہوتی ہے وہ اور زمانے میں نہیں ہوتی اور پھر ایام عزا کی وسعت بھی ہمارے ہاں تو آٹھ ربیع الاول تک رہی اور یہاں پر بھی غالباً عمل اس پر ہوگیا ہے جو بعض جگہ "چہلم" تک سلسلہ رہتا ہے بعض جگہ "چہلم" تک ایام عزا سمجھے جاتے ہیں۔

مگر وہ ایام عزا جو دو ماہ سے آٹھ دن تک ہیں لیکن پھر بھی اس عشرہ محرم کو جو خصوصیات ہوتی ہیں۔ وہ خود ایام عزا میں بھی بعد و عشرہ مجالس میں نہیں ہوتیں۔

تو آج پہلی تاریخ ہے اور عشرہ محرم شروع ہوگیا ہے اور پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں گا کہ یہ ہماری عزاداری کو دنیا مختلف پہلوؤں سے دیکھتی ہے کبھی شرک کے آئینے میں دیکھتی ہے اور کبھی بدعت کے آئینے میں دیکھتی ہے۔ مگر حقیقت میں ہمارے جتنے عزاداری کے مراسم ہیں۔ وہ کچھ یادوں کا مظاہرہ ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک قدم اور تصحیح کر دوں کہ کچھ یادیں ہیں اور کچھ تمنائیں ہیں جن کا اظہار ہے۔ یہ ہمارے عزا خانے میں علم ہیں یہ کیا ہے؟

یہ احساس ہے کہ کربلا میں علم کی حفاظت آخر دم تک کی گئی اور ایک وقت وہ آیا کہ علمدار کے گرنے سے علم زمین پر گرا تو یہ ہم علم اٹھاتے ہیں یہ ہے کہ اگر ہم ہوتے، تو علم گرنے نہ دیتے۔

بس چند جملے عرض کرنا ہیں ظاہر ہے پہلی مجلس ہے۔ آپ انشاءاللہ مشتاق ہوں گے کہ آج کوئی خاص حال بھی نہیں ہوتا بیان کرنے کا۔ تو اب یہ کیا یہ ضریحیں کیا ہوتی ہیں۔ تعزیے کیا ہوتے ہیں۔ ان ضریحوں میں ان تعزیوں میں تربتیں بنی ہوتی ہیں تو کیا مطلب ہے ہمارے پیش نظر ہے کہ ہمارے مولا تین دن تک بے گور وکفن تھے تو اس کے ماننے سے کہ اپنے مولا کی تربت کو تیار کر سکتے۔ تو آج ہم اس وقت کے بے گور وکفن ہستی کی تربت اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے ہیں۔ یادگار کے طور پر۔

کچھ حسرتیں ہیں کچھ تمنائیں ہیں ہاں یہاں شاید وہ رواج نہ ہو۔ ہمارے ہاں آخری مجلسوں میں۔ نویں تاریخ محرم کی کچھ اونٹ بھی لائے جاتے ہیں۔ ہاں ہماری یہ ہمت نہ تھی کہ بے پردہ محملیں لائیں۔ ہم وہ نسبت۔ نسبت رکھنے والی محملیں بھی لاتے ہیں تو سیاہ عماریاں ہوتی تھیں سیاہ پردے اس پر ہوتے تھے۔ مگر اس میں یہ تصور کیا ہے کہ ایک وقت شتران بے کجاوہ پر سواری کی گئی تھی۔ تو وہ یاد تھی جس کو ہم اس طرح سے پورا کرتے ہیں۔

کچھ یادیں ہیں۔ کچھ تمنائیں ہیں ہاں ذرا اس میں ہمارا ذوق یہ رہا ہے کہ مصیبت کو ہم بے نقاب نہیں دیکھنا چاہتے۔ عراق اور ایران میں تو زندہ شبیہوں کا رواج رہا۔ مگر ہمارے ذوق نے اس کا تحمل نہیں کیا۔ ہم ذوالجناح کی شبیہ بناتے ہیں۔ مگر مرکب ہو...... اس پر راکب کوئی نہ ہو اور اب ارباب عزا۔ یہ جملہ کہ ہم گہوارہ بھی لاتے ہیں...... مگر گہوارہ ہو...... اس میں بچہ کوئی نہ ہو۔

ارباب عزا۔ اب آج پہلی محرم ہے تو حسینؑ کے گھر کی پہلی مصیبت۔ وہ کیا ہے؟ نانا کے مزار سے چھٹنا (رخصت) اور صورت واقعہ یہ بتاتی ہے کہ کربلا میں کوئی رات اتنی اضطراب میں مولا پر نہ گزری۔ شب عاشور قیامت کی رات ہے مگر مولا تو تمام رات اطمینان سے عبادت میں مصروف رہے۔ اضطراب کیا تھا۔ لیکن یہ رات جس کی صبح کو مدینے سے سفر تھا اس میں مولا کو ایک جگہ قرار نہ تھا۔ کبھی ماں کی لحد پر، کبھی بھائی کے روضے پر...... اور

روایت تو یہ بتاتی ہے کہ ہر جگہ تو ایک دفعہ گئے مگر نانا کی لحد پر...... نانا کی قبر پر کئی دفعہ آئے اور پہلے بھی عرض کر چکا ہوں گا پہلے کی مجلسوں میں یہ کئی دفعہ کا تجربہ انہیں ہوگا جو زیارات سے مشرف یاب ہوئے ہوں کہ وہ وداعی جو زیارت ہوتی ہے حالانکہ وطن جاتے ہوتے ہیں۔ مگر اس میں ایسی بے تابی ہوتی ہے کہ ایک دفعہ قبر سے رخصت ہو کر الگ ہوئے۔ پھر دل نہیں مانتا۔ پھر قبر سے لپٹ جاتے ہیں۔ پھر رخصت ہوتے ہیں۔ پھر جا کر لپٹ جاتے ہیں اور یہی کیفیت مولا کی تھی کہ کئی دفعہ روضہ رسولؐ پر گئے اور آخری دفعہ گئے تو کچھ اتنا اضطراب تھا۔ اتنی پریشانی تھی کہ قبر مطہر کو سینے سے لگا کر۔ اس وقت تابوت بھی نہیں تھا بس قبر بے حجاب تھی۔ اس پر ضریح کوئی نہ تھی تو قبر کو سینے سے لگا کر۔ اب یہاں۔ جو بیان کروں گا بظاہر وہ بے جوڑ معلوم ہوتی ہے۔

یعنی جس پر اتنے اضطراب میں رات گزری ہو۔ اب اس کے بعد کیا بتاؤں کہ روایت کہتی ہے کہ قبر رسولؐ سے جو لپٹے تو سو گئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے...... غش نہیں آیا...... سو گئے...... کیا معنی سو گئے...... میں کہتا ہوں کہ نفسیات کے بدلنے سے اثر بدلتا ہے...... قبر رسولؐ سے جو لپٹے تو سینہ رسولؐ یاد آ گیا...... جس پر بچپن میں سونے کے عادی تھے لہٰذا ایسا سکون ملا کر نیند آ گئی اور نیند جو آئی تو سامنے رسولؐ نظر آئے۔

میں کہتا ہوں کہ آج جو قبر سے نکلے تو واپس نہیں گئے وہ حسینؑ کے ساتھ رہے کربلا میں رہے عاشور کے دن بھی حسینؑ کے ساتھ رہے۔

......☆......

# مجلس دوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

## جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا

(جاثیہ:۱۸)

ترجمہ: ہم نے تم کو دین کے کھلے رستہ پر قائم کر دیا ہے تو اسی رستہ پر چلو جاؤ۔

دنیا میں جس طرح ایک لہر چلی ہوئی ہے قانون شریعت اسلام کے نفاذ کی۔ اسی طرح سے ایک طبقے میں لہر چلی ہوئی ہے ترمیم شریعت اسلام کے مطالبے کی۔ اس کے لیے میں نے اصولاً یہ چیز عرض کی۔ کہ جس کو حق وضع قانون کا ہو۔ اُسی کو ترمیم قانون کا بھی حق ہے تو یہ دیکھنے کی چیز ہے کہ شریعت اسلام جس قانون کا نام ہے اُس کا واضع کون ہے۔ اگر اُس کے وضع کرنے کا حق جمہور ملت کو ہے تو ترمیم کا حق بھی جمہور ملت کو ہوگا اور اگر وضع کرنے کا حق اُس کے کسی کو نہیں ہے اور کوئی اس کا وضع کرنے والا افراد انسانی میں۔ عام جمہور ملت میں نہیں ہے۔ تو پھر ترمیم کا حق بھی اُن کو نہیں ہوگا تو اِس کے لیے میں نے اپنے سرنامہ بیان میں اس جزو آیت کو قرار دیتے ہوئے اس حقیقت کو عرض کیا کہ یہاں واضع قانون خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی نہیں ہیں۔ آپ بھی مبلغ قانون تھے۔ واضع قانون نہیں تھے۔

واضع قانون خالق کریم ہے شریعت اسلام کے آئین کا بنانے والا وہ ہے۔ اب یہ ترمیم کرنے والے حضرات جو ہیں اور کچھ میں نے نام بھی کل دے دیے تھے کہ کون حضرات زیادہ علمبردار اس کے۔ میرے علم میں ہیں تو وہ ان میں سرفہرست تو جناب اینڈرسن صاحب تھے۔ جو لندن کے۔ لندن یونیورسٹی میں اور وہاں تو کئی یونیورسٹیاں ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس یونیورسٹی میں وہ تو بہر حال وہ قانونِ اسلام کے معلم ہیں۔ استاد ہیں۔

پروفیسر ہیں قانونِ اسلام کے۔ تو انہوں نے مہم اپنی وہ قرار دے رکھی ہے کہ وہ دنیا میں مختلف مقامات پر دورے کر کے اور اسی پر اور یہی خاص موضوع ہے اُن کا۔ کہ قانونِ اسلام میں شریعت اسلام میں بہ مقتضائے حال ترمیم ہونا چاہیے اور پھر کچھ اور ممتاز افراد جو اہلِ اسلام میں ہیں وہ بھی اس کے علمبردار ہیں تو یہ حضرات۔ کچھ باتوں کو وہ تفصیل اس کی بعد میں انشاءاللہ آئے گی۔ آج بھی وہ سب چیزیں تو عرض نہیں کرنی ہیں۔

تو کچھ خاص چیزوں کو نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً پوتے کا میراث سے محروم ہونا۔ اس کو بہت ٹھنڈی سانسیں بھر کے اور انسانی ہمدردیوں کو حاصل کر کے کہتے ہیں کہ ایک تو بیچارے کا باپ وہ اُس کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور پھر وہ میراث سے بھی محروم ہو جائے تو اب اس میں۔ اہل اسلام کے ثبوت میں جو افراد ہیں۔ ان میں سے ایک کا یہ جملہ میں نے دیکھا دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اُن کی زبان سے نہیں سنا۔ اخبار میں دیکھا۔ ورنہ جملہ دیکھا تھوڑی جاتا ہے' سنا جاتا ہے تو بہر حال یہ کہ اُن کا یہ جملہ میری نظر سے گزرا...... کہ میں انسانی نقطہ نظر سے اس کے خلاف ہوں اور اس پر ترمیم چاہتا ہوں کہ اس کی ترمیم ہو جائے۔

اب وہ جو خدا سے رشتہ نہ بھی قائم رکھتے ہوں۔ وہ بھی پیغمبر خداﷺ کی طرف تو نسبت سمجھتے ہی ہیں اس قانون کی۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبرؐ اسلام کے لیے اور پھر صحابہ کا بھی طبقہ تھا اور پھر تابعین کا طبقہ تھا اور پھر وہ چودہ سو برس کے علمائے اسلام کے جو تھے ان کے سینے میں انسانی دل نہیں تھا یہ اب چودہ سو برس کے بعد یہی صاحب جو پیدا ہوئے ہیں کہ جنہیں انسانی ہمدردی کوٹ کوٹ کر دل میں بھر گئے ہے اور اس بناء پر اب ان کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ معاذ اللہ رسولؐ اور تمام پیشوایان اسلام کسی بھی نقطہ نظر کے جو ہوں' پچھلے دور میں وہ سب بڑے بے درد اور بڑے بے رحم تھے کہ انہوں نے اِس نقطہ نظر کو سامنے نہیں رکھا اور اس طرح کا مسئلہ شریعت اسلام میں موجود رہا اور اب یہ درد اسلامی رکھنے والے

افراد پیدا ہوئے ہیں، جن کو یہ درد پیدا ہوا ہے تو اب آپ ذرا غور فرمایئے کہ جس رسولؐ کو خالق نے قرآن میں کہا ہو۔ الرؤف الرحیم یعنی جو اپنے القاب ہیں۔ وہ اُسے دے دیے الرؤف اسمائے حسنائے الٰہی میں سے ہے۔

الرحیم اسمائے حسنائے الٰہی میں سے ہے۔ خالق نے کہا کہ: بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (توبہ:128) کہ یہ مومنین کے ساتھ رؤف بھی ہے اور رحیم بھی ہے کیا معنی...... یعنی اُن میں کوٹ کوٹ کر انسانی ہمدردی دل میں بھری ہوئی ہے تو اب وہ رؤف ورحیم آپ کے نزدیک بے درد تھا اور آپ بڑے دردِ انسانی رکھنے والے ہیں تو اب میں کہتا ہوں کہ بس وہ لقی حیثیت سے کوئی مسلمان ہو تو ہو مگر ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ جس کی رسولِ اسلام کے بارے میں یہ رائے ہو۔ اس کا اسلام میں کیا مقام ہو سکتا ہے۔ بہرحال میں اصولوں پر ہی تبصرہ کروں گا۔ میں بھی گفتگو میں کسی مسئلے پر اُس اصولی گفتگو سے کترا کے۔ صرف گویا اس کی ہولناکی کو دکھلا کر گزرنے والا نہیں ہوں کہ میں صرف یہ دباؤ ڈال کر۔ کہ اس طرح اسلام محفوظ نہیں رہتا۔ میں اُس پر انشاء اللہ جیسے بھی موقع ہوگا تو انسانی نقطۂ نظر سے جو جائزہ لیا جا رہا ہے اس کا اُس پر میں تبصرہ کروں گا۔

بہرحال یہ ایک مسئلہ جو بہت زیادہ زور و شور سے اس کو۔ سب سے زیادہ غالباً یہی ہے جو بہت زیادہ نمایاں طور سے پیش کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد تعدادِ ازواج کا معاملہ ہے اور اس میں بھی مرد اور عورت میں فرق کہ مرد کو حق ہے تعددِ ازواج کا...... عورت کا تعددِ ازواج کا حق نہیں ہے اور اب اُسی کے تحت میں اسی کے ساتھ پھر ایک وسیع دائرے میں ''حقوقِ نسواں'' اور عورت کا موقف اسلام میں اور پھر اسی کے ساتھ مسئلہ طلاق ہے کہ طلاق کا حق۔ مرد کے حق میں شریعت نے رکھا اور عورت کو اُس نے بے بس کر دیا۔ اس معاملے میں۔ تو یہ چیز ہے اور اسی طرح کے ضمناً تو یہ ان چیزوں کو پیش کر کے گویا۔ آجکل کے افرادِ انسانی کو شریعت اسلام کی گویا۔ معاذ اللہ

کمزوریوں پر متوجہ کیا جاتا ہے اور اس کی بناء کے اوپر ترمیم کا علم بلند کیا جاتا ہے کہ قانون اسلام میں ترمیم ہونا چاہیے تو یہ کچھ اضافوں کے ساتھ کل کے پورے بیان کا خلاصہ ہے جو میں نے سلسلہ بیان کے لیے پیش کر دیا۔ اب آج جو عرض کرنا ہے وہ یہ کہ اصل بنیادی چیز قانون کے بارے میں کہ اس کا واضع کون ہے اور اس میں پھر ترمیم کا کس کو حق ہے۔ کیونکہ یہ اصول تو غالباً ہر عقل میں آنے کا ہے۔ کہ جس کو وضع قانون کا حق۔ اُسی کو ترمیم کا بھی حق تو اب اصل یہ ہے کہ واضع قانون کون ہونا ہے۔ کون ہونا چاہیے تو۔ یہ بھی اصل۔ میں کہتا ہوں۔ کہ یہ بنیادی سوال نہیں ہے۔ اس سوال کی اصل بنیاد ایک اور ہے۔ وہ یہ کہ اصل حاکم کون ہے کیونکہ جو حاکم ہو۔ اُسی کو وضع قانون کا حق ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ حکومت کسی کی ہو۔ حکومت کسی کی ہے اور قانون بنائے کوئی اور۔ جس کی حکومت ہے اُسی کی طرف کا قانون ہونا چاہیے۔ تو اب بنیادی مسئلہ یہ نہیں رہا۔ کہ قانون بنانے کا کسے حق ہے۔ بنیادی مسئلہ یہ ہو گیا کہ اصل حکومت کس کی ہے۔ دنیا کی حکومت کا سوال نہیں ہے وہ سیاسی مسئلہ ہے۔ میں دینی حکومت کو عرض کر رہا ہوں۔ دین کے نقطہ نظر سے کہ اصل حکومت کس کی ہے۔ جس کی حکومت ہے مسلمانوں کے یہاں نہیں۔ اسلام میں......جس کی حکومت ہے۔ اسی کی طرف کا قانون ہے......اُسی کو وضع قانون کا حق۔ اُسی کو ترمیم قانون کا حق......اور اب تو جب ہم اس پر نظر ڈالتے ہیں قرآن کی روشنی میں جو مسلم دستاویز ہے۔ تمام مسلمانوں کے لیے۔ بلا تفریق فرقہ۔ تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اسلام میں بشر کی بشر پر حکومت ہی نہیں ہے۔ اسلام میں خالق بشر کی حکومت ہے بشر پر اور اس لیے دنیا میں جتنی قسم کی حکومتیں اس وقت ہیں۔ اُن میں یہ سوال ہی بے کار ہے۔ کہ کون مطابق اسلام ہے اور کون خلاف اسلام کیونکہ جتنے نام ہیں حکومتوں کے جتنی قسمیں ہیں ان کے مختلف نام ہیں وہ سب اقسام ہیں بشر کی بشر پر حکومت اور یہاں انسان کی انسان پر حکومت ہی نہیں ہے نہ ایک ایک انسان کی......نہ اکثر انسانوں کی ملا کر......نہ دس......پانچ انسانوں کے مشترک طور پر انسان کی

نہ انفرادی حیثیت سے نہ اجتماعی حیثیت سے...... حکومت نہیں ہے۔ بلکہ خالق انسان کی حکومت ہے۔ تمام نوع انسان پر یعنی انسان کی حکومت کوئی الگ نہیں ہے۔ جس کی حکومت تمام کائنات پر ہے۔ اسی کی حکومت انسان پر بھی ہے ایک جزو کائنات کی حیثیت سے جس کے زیر حکومت آفتاب ہے...... جس کے زیر حکومت ماہتاب ہے...... جس کے زیر حکومت آسمان ہے...... چاہے جس کا نام آسمان ہو اب وہ کوئی سائنس کا مسئلہ حل نہیں کرنا ہے آسمان بہر حال کسی چیز کا نام ہے تو جس کے زیر حکومت آسمان ہے جس کے زیر حکومت زمین ہے۔ جس کے زیر حکومت تمام کائنات ہے یہ انسان بھی جزو کائنات ہے۔ بس یہ انسان بھی اسی کا محکوم ہے اور اس کی حکومت کوئی الگ سے نہیں ہے کہ جو مانے اُسی پر حکومت اور جو نہ مانے اس پر حکومت نہیں۔ یہ تو وہ حکومت ہوتی ہوگی جو رائے شماری سے ہوتی ہو۔ وہ تو مانے کوئی تو اس کی حکومت ہے اس ماننے والے پر بھی اور جو نہ مانے اس پر بھی۔

اس پر بھی اُس کی حکومت ہے...... تو ممکن ہے کہ کسی اور موضوع کے تحت میں دہلی کی مجلس میں عرض کر چکا ہوں کہ آج کل تو ایک مشن ہو گیا ہے۔ اعلانِ بغاوت کا...... اور جناب سماج سے بغاوت۔ ماں باپ سے بغاوت خاندانی روایات سے بغاوت۔ اس میں سب سے اعلیٰ قسم کی...... خدا سے بغاوت۔ جس کے معنی ہیں کہ ہم اُس کی حکومت کو نہیں مانتے بغاوت کا یہی مطلب ہے کہ ہمیں اُس کی اطاعت کرنا نہیں ہے۔ مگر بس میں اس منزل پر کہا کرتا ہوں کہ آجکل اور خصوصاً معاف کریں۔ نوجوان یہ نوجوان حضرات کہ اس قسم کی زیادہ ہوائیں...... بغاوت کی۔ اس عمر کے افراد میں چلتی ہیں۔

تو ماشا اللہ یہ جوانانِ روزگار۔ جو بغاوت کو فخریہ طور پر اپنے لیے سرمایہ افتخار سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں خیر ساری بغاوتیں آپ کو مبارک ہوں۔ لیکن یہ سب سے اعلیٰ قسم کی جو بغاوت ہے تو آپ بڑے ہی باغی۔ بڑے ہی۔ ہرگز۔ ہم نہیں ماننے کے لیے تیار ہیں اور قانون اس کا۔ جو کچھ بھی ہوا کرے۔ ہمیں اس سے کیا غرض ہے ہم اسی کو نہیں مانتے تو اس

کے قانون سے کیا بحث ہے۔

تو میں ان ترقی یافتہ اعلان بغاوت کرنے والے جوانوں سے کہہ رہا ہوں انشاء اللہ مجمع کے جوان وہ تو ایسے نہیں ہونگے۔ کہ ہمارے جوان تو وہ ایسے نہیں ہونگے۔ اس لیے میں نے خوانخواہ جوانی کے اشتراک سے معذرت کرلی ان سے ورنہ وہ طبقہ جو دوسرا ہے وہ شرکت مجلس سے بھی بے نیاز ہے ہاں۔ ہاں۔ مگر دوستی کے رشتے میں آواز تک پہنچا سکتے ہیں تو اس لیے میں کہتا ہوں کہ وہ جملے ایسے جو ہر ایک کو حفظ ہو سکتے ہیں میں کہتا ہوں کہ آپ بڑے اعلان کرنے والے ہیں بغاوت کی سلطنت الٰہی سے میں تو جب جانوں کہ آپ باغی سلطنت الٰہی ہیں کہ جب وہ بھیجے تو آیئے نہیں اور جب وہ بلائے تو جایئے نہیں۔

حالانکہ کتنے ہی ترقی یافتہ اعلان بغاوت کرنے والے ہوں۔ لیکن جب اُس نے بھیجا تو چلے آئے بھئی یہ تو۔ اس وقت تک تو شعور بغاوت پیدا نہیں ہوا تھا لیکن اب تو ماشا اللہ پر پُرزے نکال لیے ہیں۔ اس شعور نے۔ اب تو وہ حد کمال تک پہنچ چکا ہے تو اب جب بلائے تو جایئے نہیں۔ تب میں سمجھوں گا کہ باغی ہیں۔

مگر میں تو دیکھتا ہوں کہ جب اُس نے بھیجا تو آئے اور کتنے ہی پُر زور نعرے بغاوت کے لگائے ہوں۔ لیکن جب وہ بلائے گا تو فوراً چلے جائیں گے۔ جب آئے تھے تو کم سے کم روئے تو تھے اور جب جائیں گے تب تو سانس تک نہ لیں گے اور یہ ہے اس انسان ضعیف البنیاد کے اعلان بغاوت کی حقیقت اور پھر جس وقت پر کہ یہ جیتی جاگتی دُنیا میں اعلان بغاوت کر رہا ہے اور یوں کہوں کہ موقع سے بغاوت میں آکر جس کو پیش کر رہا ہے عین اسی وقت پر زبان سے یہ اعلان بغاوت کر رہا ہے اور خون کی روانی اُس کی اطاعت کر رہی ہے۔ یہ زبان سے اعلانِ بغاوت کر رہا ہے اور نفس کی آمد و شد اس کے نظام کی پابند ہے۔

یہ اعلانِ بغاوت کر رہا ہے اور اُس کے ہر چھوٹی سے چھوٹی رگ۔ جسم کی۔ اور ہر چھوٹے سے چھوٹا ذرہ اس کے جسم کا۔ جو طبی اصطلاحوں میں بھی اس کا نام لے لیجئے اور

سائنسی زبان میں جو کچھ کہہ لیجیے میں تو عام زبان میں بات کرتا ہوں تو جناب وہ ہر ہر ذرہ اس کے جسم کا وہ اسی کی اطاعت کر رہا ہے جس کی بغاوت کا یہ اعلان کر رہا ہے۔

آپ اس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ صلاحیت حرکت میں۔ چاہے عمل حرکت میں بغاوت کریں پیر اس کی اطاعت کر رہے ہیں صلاحیت جنبش میں چاہے فعلیت عمل میں اس کی کتنی ہی یہ مخالفت کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دیے ہوئے اختیار سے ناجائز فائدہ اٹھا کر یہ اعلانِ بغاوت کر رہے ہیں۔

اس نے ہاتھ اب آپ کے قابو میں دے رکھے ہیں۔ تو جب تک اس نے آپ کے قابو میں رکھے ہیں۔ چاہے آپ اس کے مقاصد کے مطابق کام کیجیے چاہے اس کے مقاصد کے خلاف کام کیجیے لیکن وہ اس کو بے حس وحرکت بنادے تو جنبش تو دے لیجیے۔ پیروں کو آپ کے آپ کا تابع فرمان جب تک بنا رکھا ہے۔ تب تک چاہے اس کے صحیح راستے پر چلئے چاہے غلط راستے پر چلیے۔

لیکن وہ انھی پیروں کو بے حس وحرکت بنادے تو اپنی جگہ سے جنبش تو کر لیجیے زبان کو آپ کے ذہن میں آپ کے ارادے کا تابع بنا رکھا ہے تو چاہے تو اقرار کر لیجیے۔ چاہے انکار کر لیجیے۔ لیکن وہ اس زبان کو خاموش کردے۔ وہ اس زبان سے صلاحیت گفتگو کو صلب کرلے۔ تو کوئی بات تو کر لیجیے ایک حرف بھی زبان سے کہہ لیجیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اس کے دیے ہوئے اختیار تھے۔ جو اس نے اپنے نظام حکمت کی بناء پر دیے تھے اور آپ اعلانِ بغاوت فرما رہے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ جس وقت آپ خدا کے انکار کے لیے نہیں کہتے ہیں تو نفی کا ثبوت ہوا ہے۔ نہیں کے آخر "ن" کے ختم ہونے پر اور اس کا اقرار ہو جاتا ہے "نہیں" کے شروع ہونے پر...... کہ اس کا اقرار ہو جاتا ہے "نہیں" کے شروع ہونے پر...... کہ اگر وہ نہ ہوتا تو بات کیونکر کرتے اگر اس نے زبان دی نہ ہوتی تو کلام کیونکر کرتے اب کوئی کہے کہ جبکہ بہر حال اس کی اطاعت ہمیں کرنا ہے تو ہم سے مطالبہ کیوں ہے

اطاعت کا۔ اگر آپ کہہ رہے ہیں کہ بہرحال اطاعت ہو رہی ہے تو پھر ہم سے کا ہے کا مطالبہ ہے کہ تم اطاعت کرو تو یاد رکھیے کہ اطاعت کا مطالبہ اتنے دائرے میں ہے جتنے دائرے میں اس نے اختیار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اطاعت کا مطالبہ صرف شرافت انسانی کے اظہار کا مطالبہ ہے۔ جس کی اطاعت جبراً کرنا ہی ہے۔ اس کی اطاعت اختیاراً بھی کر لو۔ تو تمہارے جوہر انسانی کی رفعت نمودار ہو۔ ورنہ اگر اختیاری اطاعت نہیں کرو گے تو جبری اطاعت کو لینا ہے وہ تو لے ہی لی جائے گی مگر اس میں تمہارا جوہر انسانیت تھوڑی ہو گا۔ وہ اطاعت تو ایسی ہی ہو گی۔ جیسے یہ پتھر اطاعت کر رہے ہیں۔ جیسے یہ درخت اطاعت کر رہے ہیں۔ جیسے یہ حیوان اطاعت کر رہے ہیں۔ ویسی ہی اطاعت تم نے بھی کی۔ تو پھر انسان کی تخلیق کا مقصد ہی کیا تھا۔

تو حقیقت میں انسان سے مطالبہ بس یہ ہے کہ حدود اختیار میں جہاں اس کو اس نے قدرت عطا کی ہے فعل و ترک کی...... اس میں اس کا جوہر انسانی یہ ہے کہ یہ وہی رُخ اختیار کرے جو اس کی مرضی کے مطابق ہے...... جو اس کے قانون کے مطابق ہے اور اس راستے کو لے...... اختیار کرے اگر جبری اطاعت ہو تو پھر اس کو اجر کا استحقاق نہ ہو گا۔ ثواب کا استحقاق نہ ہو گا۔ تم اختیاری اطاعت کرو تو پھر جزاء عطا کی جائے گی۔ تمہیں پھر اجر عطا کیا جائے گا اور بخدا یہ ثواب پر۔ ثواب یعنی اطاعت پر جزا اور عذاب یعنی مخالفت پر سزا یہ دونوں ایک ساتھ۔ یہی یعنی جوہر اختیار جو عطا کیا گیا ہے۔ یہی پوری کارگاہِ رسالت کی بنیاد ہے دائرہ اختیار کے حدود میں۔

کیونکہ یہاں خالق کا کام جبراً اطاعت کروانا نہ تھا۔ بتانا تھا لہٰذا پیغمبروں کی ضرورت ہوئی۔ رہنمایانِ دین کی ضرورت ہوئی کہ وہ بتائیں کہ یہ راستہ صحیح ہے۔ یہ راستہ غلط ہے تو اب اسی پر بنیاد پھر جزا و سزا کی قائم ہوئی کہ اب جو عمل کرے گا اس کو ثواب۔ اسی کے لیے رسولؐ کے القاب میں برابر سے جو لقب آئے۔ ''بشیر و نذیر'' یعنی ثوابوں کے اعلان کرنا۔ یہ

'بشیر' کے ماتحت ہے اور عذاب کا اعلان کرنا۔ وہ نذیر کے ماتحت ہے۔ اب ماشاءاللہ مجمع میں قانون دان حضرات بھی ہوں گے میں کہتا ہوں کہ یہ ثواب کا اعلان کرنا یہ بھی تفضّل الٰہی ہے۔ ورنہ دنیا کی حکومتیں جو آپس کے سمجھوتے سے حکومت کرتی ہیں۔ ذاتاً حق حکومت تو صرف اللہ کو ہے آپس کی قرارداد سے جو حکومتیں قائم ہوتی ہیں ان حکومتوں میں مخالفت کی سزا ہے۔ موافقت کی جزا نہیں ہے۔ ایک دفعہ عمر میں خلاف قانون کوئی بات خدانخواستہ کر دیجئے تو پکڑ میں لے لیے جائیں گے۔ اس کی سزا ہو جائے گی...... ثبوت مل گیا تو...... اور عمر بھر اگر موافقت قانون کرتے رہے تو اس کی جزا کوئی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ تو رعایا ہونے کا فطری فرض ہے...... اور یہ خالق کریم جس کی ذاتی حکومت ہے۔ وہاں اطاعت پر جزا اور مخالفت پر سزا، میں کہتا ہوں کہ جو سزا کا اعلان ہے وہ ٹل بھی سکتا ہے۔ مگر جو جزا کا اعلان ہے وہ ٹل نہیں سکتا۔

تو اصل حاکم یہاں اللہ ہے یہی قرآن نے کہا کہ له اسلم من فی السموات (آل عمران:83) یعنی جتنے آسمان اور زمین ہیں سب۔ اس کی بارگاہ میں ہمہ تن اطاعت بنے ہوئے ہیں۔ یعنی اسلام لائے ہوئے ہیں۔ تم سے جو مطالبہ ہے وہ کوئی فطرت کے حدود سے الگ نہیں ہے۔ جس کے فطرت کے رُو سے اطاعت ہو رہی ہے اسی کی اطاعت کا تم سے مطالبہ ہے۔ تو اصل حاکم اللہ اور اس کے بعد پیغمبرؐ...... مگر یہ کہ اصل حاکم اللہ اور پیغمبر کی جو اطاعت ہے وہ بحیثیت نائب حاکم...... اب اصل حاکم وہ اور نائب حاکم رسولؐ اور نائب کی ضرورت کیوں ہوئی۔ اس لیے کہ اس کا کمال سدِراہ تھا کہ وہ اپنی زبان سے آکر احکام نافذ کرتا۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ کوئی ایسا ہو۔ جو اس بے زبان کی بات کو سنے اور ہم تک اپنی زبان سے پہنچائے۔ وہ درمیانی حیثیت رکھنے والا جو اپنی صفات کے جوہر ذات سے اس کے وجود کو حاصل کر سکے اور ہمارے ساتھ اشتراک بشریت کی وجہ سے ہم تک ان احکام کو پہنچا سکے۔ وہی اپنے دور میں رسولؐ ہوتے تھے وہی نبی ہوتے تھے تو وہ نائب حاکم اور اب اس

کے بعد اگر پیغمبرؑ ایسا ہوتا کہ بس وہ اپنے دورِ حیات تک تبلیغ کرتا رہتا اور پھر چلا جاتا اور اس کا پیغام بھی ختم ہو جاتا۔ تو پھر ضرورت اُسے اب نائب کی نہ تھی۔ لیکن چونکہ رسول کا دورِ حیات مختصر تھا اور یہ پیغام تا قیامت تھا لہٰذا اب ضرورت ہوئی کہ جب یہ دنیا سے اُٹھیں تب پھر کچھ ایسے ہوں چاہے نام بدل جائیں۔ لیکن کام وہی رہے کہ وہ اللہ کی ترجمانی اسی طرح کریں۔ جس طرح یہ اپنے دور میں کرتا تھا۔ اس طرح وہ بھی نائب اُس کے احکام کے بہ اسم پیغمبر۔ میں نے عرض کیا کہ نام سے حقیقت نہیں بدلتی۔ کام کی وحدت کو دیکھنا چاہئے وہ بہ اسم پیغمبر بہ اسم نبی و رسولؐ۔ اب اس منصب کا نام امام ہو گیا۔ وہ آج سے تھوڑی ہوا۔ ابراہیمؑ کے دور سے ہوا۔ اب ہر فرد محسوس کر سکتا ہے کہ اگر مجھے اپنے موضوع کا خیال نہ ہو تو درمیان میں کتنے موضوع آ جاتے ہیں کہ اگر میں ان ہی کا ہو رہوں تو مجلس اسی پر ختم ہو جائے۔ اب یہ امامت ابراہیمؑ کا ذکر آ گیا ضمناً۔ تو وہ اس وقت سے نام چلا۔

حقیقت پہلے سے چاہے موجود ہو مگر عہدے جو ہیں ناموں سے متعلق ہوتے ہیں۔ تو جناب یہ نام اُسی وقت سے آیا۔ حضرت ابراہیمؑ کے دور سے۔ تو اب دورِ امامت ہو گیا مگر ہاں کسی کے ذہن میں یہ خلش ہو سکتی ہے کہ اور حقیقت ہے کہ عرض کر دوں چاہے کہ وہ موضوع نہ ہو کہ کوئی کہے کہ یہ نام کیوں بدلا تو کیا بات ہے اور وہ آخر میں خاتم الانبیاء ہو گئے اور پھر بھی کام باقی رہا۔ تو میں ایک غلط فہمی کو دُور کر دوں۔ وہ بہت سے ذہن میں یا کسی نہ کسی کے ذہن میں شاید ہو یا بہت سے ذہنوں میں ہوں کہ حضرت ابراہیمؑ کی منزل پر یہ ثبوت ہو گیا کہ امامت کا عہدہ نبوت و رسالت سے اونچا ہے تبھی تو نبیؑ ہوتے ہوئے رسولؑ ہوتے ہوئے اور پھر امتحان ہو رہا ہے اگر نبوت و رسالت ذمہ دار ہوتی صلاحیت منصب کی تو امتحان کی کیا ضرورت تھی یہ امتحان ہونا اس بلندی منصب کا ثبوت ہے کہ دیکھو ہر نبیؑ بھی مستحق امامت نہیں ہوتا۔ ہر رسول بھی مستحق امامت نہیں ہوتا۔ اس لیے جو نبیؑ ہے اور رسولؑ ہے تو اُسے بھی اب اس منصب کا اعلان کرنے کے لیے ہم امتحان خصوصی لیں گے اور امتحان

خصوصی کا نتیجہ بھی اس شان سے نمودار ہوگا۔ جسے وہ اپنی زبان میں کہے کیا کہے کہ: الممهن......(بقرہ:124) اور ماشاء اللہ اس مجمع میں کون ہوگا جو امتحانوں کے تقاضوں سے واقف نہ ہو۔ جو امتحان دینے والے طالب علم ہیں وہ تو براہ راست...... جو نہیں ہیں...... وہ کبھی تو دے چکے ہیں تو امتحان کے تقاضوں سے اس تعلیم یافتہ مجمع میں کون ایسا ہوگا جو ناواقف ہو یاد رکھئے کہ ہر امتحان میں بڑے سے بڑا درجہ وہ فرسٹ ڈویژن کا ہوتا ہے اور فرسٹ میں بھی ایک ہی درجہ تھوڑی ہوتا ہے اس میں بھی جو فیصدی اسی ہے وہ بھی فرسٹ ہے اور جو فیصدی پچاسی ہے۔ وہ بھی فرسٹ ہے اور اب تو معیار سنا ہے کہ فیصدی پینسٹھ سے فرسٹ شروع ہو جاتا ہے اور کہیں خصوصی ستر سے شروع ہوتا تھا۔ تو کہیں پچھتر سے فرسٹ شروع ہوتا تھا۔ غرض وہاں سے کتنے درجے ہیں فرسٹ میں۔ ہیں سب فرسٹ اصطلاحاً مگر اس میں بھی اب یہ نمبروں سے امتحان کے یہ درجے قائم ہوتے ہیں۔ 80 فیصد اور 85 فیصد اور 90 فیصد مگر جناب سوائے ریاضی کے اس میں تو پورے لیے جاتے ہیں۔ مگر اور ہر مضمون میں ممتحن کچھ نہ کچھ کم کر لیتا ہے۔ 98 فیصد ہوئے تو بہت ہوئے اور 99 فیصد ہوئے تو کیا کہنا۔ مگر فیصدی 99 میں بھی تو وہ ایک کی کمی...... ایک کی کسر رہ گئی...... اب یہ ممتحن وہ ہے جو "مثقال کل ذرہ" سے واقف ہے وہ نتیجہ امتحان میں کہہ رہا ہے۔ اس نے پورا پورا امتحان کا حق ادا کر دیا۔ بعض درخواست نمبروں کے ایسے ہوتے ہیں کہ جو الگ سے ظاہر نہیں ہو سکتے۔ جو فیصدی اسی ۸۰ ہیں۔ وہ بھی ہیں اگرچہ وہ بھی برابر نہیں ہیں۔ ممتحن کی نظر میں ان میں بھی کسی کو امتیاز ہے۔ مگر وہ امتیاز ایسا ہے کہ وہ اُسے الگ نمایاں نہیں کر سکتا۔ مگر یہ وہ عالم الغیب ہے جس کے لیے کوئی کم سے کم فرق بھی نگاہ سے پنہاں نہیں رہ سکتا۔ مخفی نہیں رہ سکتا تو اب یہ امامت کا جو امتحان ہے اس میں وہ کہہ رہا ہے کہ پورا پورا۔ یعنی فیصدی سو اب میں کہتا ہوں کہ اس سے تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نبوت تک ترک اولیٰ کی گنجائش تھی۔ رسالت تک ترک اولیٰ کی گنجائش تھی۔ لیکن امامت کا منصب آ گیا تو ترک اولیٰ کا بھی کوئی ڈر نہ رہا

اور جب اس درجے تک پہنچ گئی...... کامیابی...... تو اعلان ہوتا ہے میں تمہیں خلق خدا کا امام بناتا ہوں۔ نبوت ملی تو ہاتھ نہیں پھیلایا...... رسالت ملی تو دست سوال دراز نہیں کیا...... لیکن اب امامت کا اعلان ہوا تو فوراً کہہ دیا: ومن ذریتی ...... یہ مجھے تو بنا دیا اور میری اولاد میں سے بھی اور میں کہتا ہوں کہ کیا ہے صرف سوال نہیں کیا بلند ظرف افراد کو اگر کوئی عطیہ ملے تو آگے سوال کا ہاتھ پھیلانا گویا بلندی ظرف کے خلاف سمجھتے ہیں۔ مگر یہ عطیہ نہیں تھا۔ نتیجہ امتحان تھا۔

لہٰذا طالب علم کا دل بڑھا ہوا ہے کہ یہ تو اعلان ہوا نتیجہ امتحان کا کہ تم کو امام بنایا۔ اب انعام کامیابی بھی تو ملے اور اس کے بعد مختصر الفاظ میں۔ آپ کی جانی پہچانی حقیقت کو پیش کر رہا ہوں کہ اللہ کے دیے ہوئے علم سے جانتے تھے کہ نبوت ختم ہونے والی ہے اللہ کے دیے ہوئے علم سے جانتے تھے کہ رسالت ختم ہونے والی ہے تو جو منصب ختم ہو جائے گا...... اُسے کیا مانگوں۔ جو منصب قیامت تک برقرار رہے گا اسے مانگوں...... اب یہ دُعائے ابراہیمی۔ خالق نے اس کے قبولیت کا اعلان کر دیا۔ اب اس آیت کو میں تفصیل سے عرض نہیں کر رہا ہوں۔ بہرحال وہ دعائے ابراہیمی تھی۔ تو شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے لکھا ہے۔ مدارج النبوۃ میں۔ رسولؐ نے فرمایا: وہ دُعائے ابراہیمی پہنچی مجھ تک اور علیؑ تک۔ تو اس بنا پر چاہے میں نے عرض کیا کہ بعض ذہنوں میں نہ ہو کہیں۔ ہمارے رسولؐ فقط نبیؐ نہیں ہیں۔ فقط رسولؐ نہیں ہیں اگر صرف نبیؐ اور رسولؐ ہوں تو ان کا درجہ حضرت ابراہیمؑ سے کمتر ہو جائے بلکہ یہ نبی بھی ہیں۔ رسولؐ بھی ہیں اور امام بھی ہیں۔ یہ تینوں منصب ہمارے پیغمبر کو حاصل تھے۔ اب پھر اتنا بیان ہو چکا اور اب ذہن میں اس کے آ گیا اور یہیں پر ایک واقعہ یاد آ گیا تو عرض کر دوں کہ نظام حیدر آباد کہ وہ ایسا ذوق علم رکھتے تھے کہ جو بھی صاحب علم جاتا تھا وہ اُس سے بہت ہی گہرے مسائل پیش کرتے تھے اور اس کے جواب اُس سے حاصل کرتے تھے تو ایک مرتبہ انہوں نے سوال سوچ رکھا اور میں جو پہنچا۔ تو کہنے لگے کہ ہاں مولوی

صاحب آپ سے یہ دریافت کرنا ہے۔ اب یہ پیش نظر رہے کہ حضرت امام علی ابن ابی طالبؑ کی فضیلت اور کمال کو وہ انتہائی نقطے پر جانتے تھے اور تہہ دل سے قبول کرتے تھے تو اب دیکھئے کتنا مشکل سوال تھا ان کا۔

خیر گہرا سوال کہ کوئی شخص کسی عہدے کا مستحق نہ ہو...... اتفاق سے...... تو وہ عہدہ ختم کر دیا جاتا ہے جبکہ ایک ذات موجود ہے جو اس منصب کی لیاقت رکھتی ہے وہ اس بات کو جو ذہن میں ہوتی تھی۔ بہت زور دے کر کہتے تھے...... جبکہ لیاقت رکھتی ہے ایک ذات۔ تو پھر وہ عہدہ کیوں ختم کیا جائے۔ ہمارے رسولؐ کے بعد حضرت علیؑ ایک ایسی ہستی ہے کہ جو نبوت و رسالت کا کام انجام دے سکتے تھے تو پھر نبوت کیوں ختم ہوئی۔ اب وہ انہیں اتنا ذہن نشین تھا کہ وہ مسلسل وہ اس جملے کو دہرائے جاتے تھے۔ جب ایک آدمی اس لائق موجود ہے تو پھر عہدہ کیوں ختم ہوا۔

اب جب وہ اپنے سوال سے پوری طرح محظوظ ہو چکے اور سلسلہ اس کے دہرانے کا اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے اس مسئلے پر میں نے بھی غور نہیں کیا تھا۔ مگر جتنی دیر میں انہوں نے دہرایا سوال کو۔ اتنی دیر میں گویا۔ ممکن ہے کہ نہ دہراتے تو اس وقت بھی قدرت کی طرف سے جواب زبان پر آجاتا۔ مگر اب ظاہری اسباب سے اتنی فرصت مجھے مل گئی اس پر غور کرنے کی۔ کہ بس جونہی وہ خاموش ہوئے۔ ذرا ہمہ تن گوش بصد اشتیاق۔ انہوں نے آنکھیں گاڑھ دیں میرے اوپر کہ اب یہ کیا کہتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ جی عہدہ ہمیشہ اس وجہ سے ختم نہیں ہوتا ہے کہ کوئی آدمی اس کے لائق نہیں رہا۔ بلکہ کبھی اس لیے بھی ختم ہو جاتا ہے کہ وہ کام باقی نہیں رہا اور اس کے لیے ذرا وہ طلب گار تشریح ہوئے گویا وہ اپنی نگاہوں سے تو میں نے کہا کہ یہ تو ہر ایک کو تجربہ ہوگا کہ زمانہ جنگ میں بہت سے نئے محکمے قائم ہوتے ہیں اور جب جنگ ختم ہو جاتی ہے اب ہندوستان ہوتا تو میں ایمرجنسی کہتا کہ ایمرجنسی کے دور میں۔ ہمیں تو سابقہ اس کا رہا ہے۔

تو وہ ایمرجنسی کے دور میں بہت سے نئے منصب۔ نئے ادارے قائم ہوئے اور جب جنگ ختم ہوگئی جب ایمرجنسی ختم ہوگئی تو آدمی دوسرے کہاں لیجائے بلکہ وہ وہیں رہ گئے۔ موجود مگر پھر بھی وہ جگہیں ختم ہوگئیں۔ تو اس طرح سے نبوت۔ اس کے معنی ہیں خبر دینا۔ جب تک ایک بھی خبر اللہ کے ہاں جو نہیں دے دی گئی ہے تو اس وقت تک نبی کی ضرورت ہے رسولؐ کے معنی ہیں۔ پیغام پہنچانے والا جب تک ایک بھی پیغام ہے۔ اس وقت تک رسولؐ کی ضرورت ہے مگر امام کے معنی ہیں۔ کسی راستے پر آگے آگے چلنے والا۔ جب تک وہ راستہ قائم ہے۔ جب تک چلنے والے قائم ہیں۔ تب تک اس پیش رو کی ضرورت ہے۔ نبوت اس لیے نہیں ختم ہوئی کہ اُس کے لائق آدمی نہیں رہا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ کام ختم ہوگیا۔

رسالت اس لیے ختم ہوگئی کہ وہ اگرچہ آدمی موجود ہے اس کام کو انجام والا۔ مگر وہ کام ہی اب باقی نہیں رہا ہے۔ مگر امامت وہ منصب ہے کہ جس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ جب تک راہ قائم ہے راہ رو قائم ہیں تب تک پیشرو کی بھی ضرورت ہے۔

تو بس اسی لیے نبوت ختم ہوگئی۔ تو اب نبوت میں کسی نائب کی ضرورت نہیں ہے جو جگہ ختم ہو جاتی ہے وہاں جانشین تھوڑی درکار ہوتا ہے۔ رسالت ختم ہوگئی۔ تو رسالت میں کسی جانشین کی ضرورت نہیں ہے اور جانشین رسالت میں ہوتا تو رسولؐ ہی کہلاتا۔ مگر امامت بھی چونکہ پیغمبر کو حاصل تھی اور یہ کام باقی ہے لہٰذا اب جو جانشین ہوگا۔ وہ نہ نبی کہلائے گا نہ رسولؐ کہلائے گا بلکہ وہ امام کہلائے گا۔ اور اسی لیے خالق اعلان کرے گا خلق خدا کے سامنے کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ (نساء:59) اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی جو تم میں سے ہیں۔ بس اللہ کے معنی سب جانتے تھے۔ رسولؐ کے معنی بقدر صلاحیت سب جانتے تھے مگر اولی الامر میں ذرا اب گنجائش ہوگئی کہ اولی الامر کون ہیں اور دُنیا نے دیکھا کہ حکم چلا کون رہے ہیں۔

بس جو حکم چلا رہے ہیں وہ اولی الامر ہیں۔ مگر بس ایک جملہ کہہ کے آگے بڑھوں گا کہ مالک مکان کون ہوگا۔ صاحب مکان کون ہوگا۔ جو مالک مکان ہو یا جو قابض مکان ہو......بس ویسے ہی اولی الامر کے معنی صاحبان امر......تو یہ نہ دیکھئے کہ امر کے منصب پر کھڑا کون ہے......امر کی مسند پر بیٹھا کون ہے......یہ دیکھئے کہ امر کا حق اس کی طرف سے کسے ہے......پس اس کی زبان میں وہ اولی الامر ہے۔ ہاں ایک لفظ سے دنیا ممکن ہے فائدہ اٹھائے کہ کہا گیا ہے کہ اولی الامر منکم یہ صاحبانِ امر جو تمہیں میں سے ہیں......تو تمہیں میں سے یعنی ہمیں میں سے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں اولی الامر منکم میں منکم کوئی نیا تو نہیں ہے وہ تو پیغمبر کو بھی کہا گیا۔ بَعَثَ رَسُوْلٌ منکم رسولؐ بھیجا اُنہی میں سے۔ رسولؐ کیلئے بھی منکم کہا گیا اور اولی الامر کے لیے بھی منکم کہا گیا۔ مگر رسولؐ بھی منکم تھے۔ ان کے مقرر کیے ہوئے نہیں تھے اسی طرح یہ بھی منکم ہیں مگر تمہارے مقرر کیے ہوئے نہیں ہیں۔

تو اب اللہ کی اطاعت ہے تو اصل حاکم ہے۔ رسولؐ کی اطاعت ہے تو نائب حاکم کی حیثیت سے اور جو حقیقی اولامر ہیں ان کی طرف سے۔ اللہ کی طرف سے صاحبان امر ہیں اور وہ رسولؐ کی اور خدا کی نیابت کے وہ بھی اپنے دور میں اس کے ترجمان ہیں۔ لہٰذا اس کی طرف کے وہ نائب ہیں پس آگے نہیں پڑھوں گا اب تو ظاہر ہے جتنا بیان ہونا چاہیے تھا وہ ہوگیا، جہاں تک ہو سکے ممکن تو اس بناء پر اب آگے نہیں پڑھوں گا۔

کہ اللہ نے جس کی اطاعت کا حکم دیا ہو۔ تو اس سے کوئی بیعت کا مطالبہ کرے تو وہ کیونکر بیعت کرے گا وہ کیونکر بیعت کرے گا پس دنیا کہتی ہے ''آخر حسین کو اتنا انکار کیوں ہے۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں کہتے ہیں کہ معاذ اللہ بڑے ضدی تھے کہ سب کچھ ہوگیا اور بیعت نہیں کی۔ میں کہتا ہوں کہ آپ اس رُخ سے دیکھتے ہیں کہ ان کو اتنا انکار بیعت سے کیوں ہے آخر ادھر سے کیوں نہیں سوچتے کہ یزید کو اتنا اصرار بیعت کا کیوں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اتنی وسیع شہنشاہت کا جو مالک ہے اور تمام عالم اسلام جس کی اطاعت کا اقرار کر چکا

ہے اگر ایک گوشہ نشین۔ عبادت گزار جو محلہ بنی ہاشم کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے وہ بیعت نہ کرے تو اس کا کیا بگڑتا تھا۔ یہ پوری طاقت اپنی شہنشاہی کی کیوں صرف کر دی۔ اس سے بیعت لینے پر۔ تو وہ جانتا تھا کہ یہ کوئی ایک فردِ عرب نہیں ہے یہ اس نظام کے نمائندہ ہیں جس کے نام پر میں حکومت کر رہا ہوں۔ تو جب تک انہوں نے بیعت نہیں کی ہے اب جو کچھ عرض کر رہا ہوں۔ تو یہ تمام میرے موضوع ہی سے بالکل متعلق ہے کہ جب تک انہوں نے بیعت نہیں کی ہے اس وقت تک نظام شریعت نظام حکومت کے مقابلے میں قائم ہے لیکن جس دن یہ بیعت کر لیں تو ہمیشہ کے لیے حکومت کے راستے سے شریعت ہٹ جائے گی تو یہ تھا۔ کہ پوری طاقت صرف کر دی۔ ان سے بیعت حاصل کرنے کی کوشش میں اور بس ایک جملہ ہے جس میں پوری تاریخ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ یزید تو پہچانتا تھا کہ حسینؑ کون ہیں...... اور کیا حسینؑ خود اپنے کو نہیں پہچانتے تھے کہ میں کون ہوں۔ بس اس لیے یزید کو اصرار تھا انتہائی اور اسی وجہ ان کو انکار تھا۔ یہ جانتے تھے کہ آج اگر میرے بڑے بھائی حسن مجتبیٰ ہوتے تو مطالبہ بیعت ان سے ہوتا مجھ سے نہ ہوتا اگر ہمارے پدر بزرگوار حضرت علی مرتضیٰ ہوتے تو جو کچھ بھی لڑائی لڑنا ہوتی تو وہ ان سے لڑی جاتی ہم سے نہ لڑی جاتی اور اگر میرے نانا حضرت محمد ﷺ ہوتے تو جو کچھ بھی سند جواز حکومت کی مانگنا ہوتی ہے اُن سے مانگ لی جاتی۔ تو چونکہ میرے نانا نہیں ہیں...... میرے باپ نہیں ہیں...... میرے بڑے بھائی نہیں ہیں...... میں ہوں...... لہٰذا مجھ سے بیعت طلب کی جا رہی ہے...... تو اگر میں بیعت کر لوں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے میرے بڑے بھائی ہوتے تھے وہ بیعت کر لیتے اور اگر میرے والد بزرگوار ہوتے تو وہ اطاعت کر لیتے۔ اگر میرے نانا ہوتے تو وہ تسلیم کر لیتے یعنی میرا بیعت نہ کرنا یہ درحقیقت ان سب کا بیعت نہ کرنا ہے اور اگر میں بیعت کر لوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان سب نے اطاعت کر لی۔

اور پھر میں تو شروع سے یہی عرض کر رہا ہوں کہ میرا موضوع ہی یہی ہے کہ اصل ان

کا پیغام تھوڑی ہے اصل نظام ان کا تھوڑی ہے تو ہم نے بیعت کر لی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس صاحب نظام نے مان لیا جس کا نظام ہے۔ تو اب حسین کی ذات حسین نہیں رہی۔ بلکہ حسین کے پیش نظر ہے اپنے باپ کی عزت اپنے بھائی کا وقار۔ اپنے نانا کا اعزاز اور میں تو کہتا ہوں کہ اپنے خدا کی ذات...... یہ ان کے پیش نظر ہے اسی لیے جانتے تھے کہ بیعت نہ کرنے کا انجام کیا ہوگا۔ مگر سب کچھ گوارا ہے۔ جب اعلان کر رہے تھے اپنے قولِ امر سے کہ بیعت نہیں کروں گا تو اس وقت تک دُنیا نہیں جانتی تھی کہ اس نفی میں کیا کیا مضمر ہے مگر انہوں نے تو اپنے دل کی گہرائیوں میں۔ اللہ کے دیے ہوئے علم سے حقیقتوں کے علوم کے آئینے میں اور جو قرآن کی بناء پر بھی اور عقل عمومی کے جو تقاضے ہیں۔ ان کی بنا پر بھی جانتے تھے کہ اس نفی میں کیا کیا مضمر ہے۔ جب کہا کہ بیعت نہیں کروں گا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ چاہے جو ہو جائے اب جو بعد میں ہوا ہے یہ تفسیر ہے اس نفی کی۔

بیعت نہیں کروں گا...... چاہے گھر چھوڑ دینا پڑے

بیعت نہیں کروں گا...... چاہے خانہ خدا میں بھی پناہ نہ ملے

بیعت نہیں کروں گا...... چاہے چاروں طرف سے گھیر لیے جاؤں

بیعت نہیں کروں گا...... چاہے پانی بھی بند کر دیا جائے

اور پھر روز عاشور کی جتنی بھی قربانیاں ہیں وہ سب اسی نفی میں مضمر ہیں۔

بیعت نہیں کروں گا...... چاہے پورا گھر کٹ جائے

بیعت نہیں کروں گا...... چاہے تمام اصحاب داغ جدائی دے جائیں

بیعت نہیں کروں گا...... چاہے برابر کا بھائی چھوٹ جائے

بیعت نہیں کروں گا...... چاہے قاسم جیسا بھتیجا نشانہ تیغ ستم ہو جائے

بیعت نہیں کروں گا...... چاہے علی اکبر ایسا بیٹا وہ تہہ تیغ ہو جائے

بیعت نہیں کروں گا...... اس نفی میں یہ کچھ مضمر تھا اور اہل عزا...... تو کل سفر مجملاً عرض

کیا تھا مدینے سے اور درمیان کی منزل ہے کہ خانہ خدا میں پناہ ملی وہاں پناہ نہیں ملی۔ حاجیوں کے بھیس میں لوگ آئے جنہیں ہدایت تھی کہ جہاں ملیں وہاں گرفتار کرلو۔ ہرایک سے حسین کیا کہتے کہ کیوں چلا جارہا ہوں مگر غیر معمولی واقعہ ہے نا...... کہ دنیا کھنچی آرہی ہے کعبے کی طرف اور وہ جس نے 25 حج پاپیادہ کیے ہوئے ہوئے اور عین حج پر...... دو دن باقی ہیں...... وہ حج کو عمرے سے بدل کر چلا جارہا ہے اور راستے میں جو ملتا ہے وہ حیرت سے پوچھتا ہے کہ ارے دو دن ہی تو باقی ہیں اور آپ چلے جارہے ہیں...... خدا کی قسم...... ہر پوچھنے والے کا سوال لگتا ہے دل پر۔

مگر ہرایک سے کیا بتائیں کیوں جارہے ہیں۔ کسی سے کہہ دیا کہ اگر جلدی نہ کرتا تو فوراً گرفتار ہوجاتے...... اس طرح نکل کھڑے ہوئے سفر کی منزلیں طے کیں آج دوسری محرم ہے اور دوسری محرم کے معنی ہیں کہ مدینے سے چلا ہوا مسافر کربلا پہنچا اور ارادتاً تھوڑی کہہ رہے ہیں۔ خط آیا تھا ابن زیاد کا (ابن سعد کی طرف) حُر کے پاس خط آیا۔ دیکھو جہاں بھی یہ خط پہنچے وہیں پر ٹھہرالو۔ وہیں پر روک لو اور اس نے یہ خط لاکر حسین کے سامنے رکھ دیا کہ دیکھیے۔ مجھے یہ ہدایت ہے ساتھ والے جو تھے۔ انہوں نے پاس کی بستیوں کے نام بتائے مگر خط کے آخر میں دو سطریں تھیں کہ دیکھو ایسی جگہ ٹھہرانا۔ جہاں نہ پانی موجود ہو۔ نہ گھاس موجود ہو۔

پانی نہ موجود ہو...... سواروں کی خاطر
اور گھاس نہ موجود ہو...... مرکبوں کی خاطر

شہسوار عرب تھے۔ جانتے تھے کہ میدان جنگ میں گھوڑا برابر کا سپاہی ہوتا ہے برابر سے کام کرتا ہے اپنے شہسوار کے ساتھ میدان جنگ میں۔

لہٰذا واقعات آپ کے سامنے ہیں اس کو بیان کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیا اچھا صلہ ہے کہ "راکب و مرکب کو سیراب کرو" یہ حسین کی ہدایت تھی اور اب اس کا جواب یہ ہے کہ

راکب بھی پیاسے رہیں اور مرکب بھی بھوکے رہیں اور یہ خط حسین کے سامنے وہ لاکے پیش کر دیتا ہے اور کہتا ہے مجھے یہ ہدایت ہے کہ میں ایسی جگہ کسی قریے میں کسی بستی میں نہیں...... ایسی جگہ ٹھہراؤں اب کتب مقاتل میں ہے کہ قدرت کی طرف کا بھی انتظام ہو گیا کہ پھر بھی اس گفتگو کے ساتھ بھی حسین کچھ آگے بڑھے مگر اب مرکب حسین کا آگے نہیں بڑھتا اور اسے تاریخ اسلام سے کوئی واقف صاف انکار نہیں کر سکتا۔ اس واقعے سے ہجرت کے وقت رسولؐ کو بھی گذرنا پڑا تھا ہر ایک مگر ہاں ہاں بات اُلٹی تھی وہاں ہر ایک کہہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں ٹھہریے...... فرزند رسولؐ کہیں نہیں ٹھہرنے دیتے۔ مگر وہاں بھی لوگوں کے اصرار کے بعد کہ ہمارے ہاں ٹھہریے...... مجسم خلق عظیم نے...... میں کہتا ہوں یہ ہدایت ربانی...... یہ کہا کہ میں کی کی دل شکنی کروں، یہ میرے مرکب پر چھوڑ دو جہاں یہ ٹھہر جائے۔

یہ جملہ ہے تاریخ کا کہ چھوڑ دو اسے...... اسے فرمان ہے وہاں سے اسے حکم ہے...... جہاں حکم الٰہی ہو گا...... وہاں یہ ٹھہرے گا۔ ہاں ایک مقتل خیام ہے سامنے ہے...... دنیا ذاتِ رسولؐ میں کہتی ہے کون سے افعال ان کے یہ حکم الٰہی ہے اور کون یہ حکم بطور خود ہیں...... میں کہتا ہوں کہ یہ وہ ہستیاں ہیں کہ ان کے افعال کب بغیر اشارہ ربانی ہوں گے ان کے مادہ بدل نہیں سکتے تھے فرماتے ہیں۔

چھوڑ دو جو حکم رب ہے اُس سے یہ گریز نہیں کرے گا...... گریز نہیں کرے گا وہیں پر جائے گا۔ جہاں حکم الٰہی ہے چنانچہ قدرت کی طرف سے جناب ایوب انصاری کو یہ فخر حاصل ہوا کہ مرکب رسولؐ ان کے مکان کے سامنے رُک گیا اور وہاں حضرتؐ نے قیام فرمایا تو اگر نانا کا مرکب حکم الٰہی کا پابند ہو۔ تو نواسے کے لیے...... بس وہاں وہ مرکب رسولؐ ناقہ تھا...... یہاں مرکب حسین وہ ہے...... جس کی یاد ہم قائم کرتے ہیں۔ تو کچھ انتظام قدرت تھا کہ قدم اُس نے آگے نہیں بڑھایا اور دنیا کے دکھانے کے لیے کہ یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں ہے۔

روایت بتاتی ہے کہ مولا نے سات مرکب بدلے ایک گھوڑے نے نہیں قدم بڑھایا تو دوسرا گھوڑا لاؤ...... سات مرکب بدلے...... مگر قدم کسی نے آگے نہیں بڑھایا...... تو اب مولا نے جو کہا خدا کی قسم پورا مرثیہ ہے کربلا کا کہ بس بس ٹھہر جاؤ۔

یہ حسین نے مستقبل کا مرثیہ پڑھا ہے حسین کا ہر ہر جملہ ایک شعبہ ہے مصائب کربلا کا...... بس اسی کو مختصر الفاظ میں ترجمہ سن لیجیے اور ذرا سی تشریح کہ فرماتے ہیں۔

کہ "بس بس ٹھہرو یہیں ہمارے خیمے نصب ہونگے" مولا کب تک خیمے رہیں گے۔ بس چند جملے آپ کے لیے دفتر مصیبت ہیں...... مولا فرماتے ہیں۔

"یہاں ہمارا سامان رکھا جائے گا" میں کہتا ہوں جب تک لوٹا نہ جائے۔ اور اس کے بعد مولا نے کیا فرمایا۔ ارے یہاں ہماری حرمت کی...... ہتک حرمت ہوگی...... اب اسے میں نہیں عرض کرسکتا کہ کہاں تک ہوتی رہی اور بس آخری جملہ کہ ارے یہاں ہمارے خون بہیں گے۔ اب کیا تفسیر کروں کہ کس کس کا خون بہا۔

ارے کسی کے سینے کا خون
کسی کے ہاتھوں کا خون
مولا کے ہر حصہ جسم کا خون
بس ایک جملہ اور اس پہ ختم

بس ایک خون کو مولا نے زمین پہ نہیں بہنے دیا اور وہ ایک بے گناہ کا خون جسے مولا نے ہاتھوں پر لے کے......

......☆......

# مجلس سوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا

(جاثیہ:۱۸)

ترجمہ: ہم نے تم کو دین کے کھلے رستہ پر قائم کر دیا ہے تو اسی رستہ پر چلو جاؤ۔

شریعت اور دین دین اور شریعت یہ دونوں درس و پیاں کی حیثیت رکھتے ہیں دین کا تصور اگر محدود رکھا جائے تو پھر شریعت بھی لازماً محدود ہو جائے گی۔

اسلام اور دوسرے ادیان میں یہی فرق ہے بہت بڑا کہ دوسرے دین جو ہیں اور سب سے زیادہ دنیا میں شاید جس کا دائرہ وسیع ہے اس میں ان سبھی سے۔یعنی دنیا کی مردم شماری کے لحاظ سے اس کے پیرو سب سے زیادہ ہیں۔تو وہاں خود دین کا دائرہ محدود سمجھا جاتا ہے یعنی بس ایک خاص طریقہ عبادت ہے تو اُس طریقہ عبادت کا اگر پابند ہے اور عامل ہے تو بس دیندار ہے۔اُس دین کا پیرو سمجھا جائے گا اور باقی انسان کے نظامِ حیات سے اس دین کا کوئی تعلق نہیں ہے۔نظامِ حیات میں اُس دین کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مثلاً ایک عیسائی ڈاکٹر ہے تو بس ہفتے میں ایک دن جو مقرر ہے عبادت کا۔اُس میں وہ اپنے مرکز عبادت میں چلا جائے اور وہ جو رسومِ عبادت ہیں اُسے انجام دے لے۔تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عیسائی ہے۔اب اس کے بعد ہفتے کے چھ دن میں وہ ڈاکٹر ہے اس میں اُس عیسائیت کا کوئی دخل نہیں ہے۔جو پیشے کے تقاضے ہیں۔ان پر وہ عامل ہو۔تو دین کو کوئی سروکار اس سے نہیں ہے۔بس یہ ایک تاجر ہے چھ دن وہ بس تاجر ہے اور وہ ساتویں دن اپنے اُس معبد میں رسومِ عبادت ادا کر لے۔تو بس اُس دن نمایاں ہو گا کہ یہ کس دین کا

پیرو ہے۔ تو نظام حیات ایک الگ ہے اور دین ایک الگ چیز ہے۔
اسلام میں یہ نہیں ہے اسلام میں دین نام ہے اُس روح کا۔ جو زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما ہوتی ہے۔ یہاں یہ نہیں ہے کہ ڈاکٹر ہے تو بس ڈاکٹر ہے اب اُس میں دین کا کوئی سوال نہیں ہے اور تاجر ہے تو بس تاجر ہے اُس میں دین کا کوئی سوال نہیں ہے۔
اس کو دوسرے لفظوں میں میں سمیٹ کر یوں کہوں گا کہ دُنیا کے تصور میں دین ایک شعبہ حیات ہے اور اسلام جس دین کا نام ہے وہ کل حیات ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ مستقل موضوع تو میرا ہے نہیں۔ یہ درحقیقت اس میں ایک فریق جزوی حیثیت سے میں عرض کر رہا ہوں۔ تو اس کے تمام شعبوں کو پھیلا کر نہیں عرض سکتا۔ لیکن ذہن نشین کرنے کے لیے۔
میں کہتا ہوں کہ یہاں ڈاکٹر بھی ہے تو اُسے مسلم ڈاکٹر ہونا ہے...... تاجر بھی ہے تو اُسے مسلم تاجر ہونا ہے...... یہ اسلام ہر شعبہ حیات میں اُس کے کارفرما ہے۔ اب کوئی کہے کہ صاحب ڈاکٹر ہونے میں مسلم اور غیر مسلم ہونے کی تفریق کیا ہے۔ تو میں اُس کو یوں روزمرہ کی زندگی میں عرض کروں گا کہ...... مریض ایسا آیا کہ جسے ڈاکٹر سمجھتا ہے کہ معمولی مرض ہے اور ہر ڈاکٹر اس کا علاج کرلے گا۔ تو اب جو رسمی فیس ہے مقرر۔ وہ بس لے کہ وہ ایک عام چیز ہے لیکن اور زیادہ یہ مول تول کا موقع نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا علاج نہ کرے گا۔ کسی اور ڈاکٹر کے پاس چلا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی مریض ایسا آیا جسے اُس نے اپنے کمال فن کی بناء پر یہ اندازہ کرلیا کہ سوا میرے کوئی اس کا علاج کر ہی نہیں سکتا۔ تو یہاں پیشے کا تقاضہ یہ ہے کہ یہی موقع ہے۔ اپنے فن کی پوری قیمت وصول کرنے کا۔ یعنی اگر ہم یہاں یہ کہیں گے کہ اس کی زندگی ہی نہیں ہو سکتی۔ تو اب وقت اس کا ہے کہ جتنے بھی زیادہ سے زیادہ اپنے کمال فن کی قیمت حاصل کرسکتے ہو اتنا حاصل کرو...... اُس نے کہہ بھی دیا کہ دیکھو میرے سوا کہیں اور جاؤ گے تو یہ بچ نہیں سکتا مریض۔ وہ بھی فرض کیجئے کہ بہت سی جگہ کی ٹھوکریں کھا کے آیا ہو۔ تو وہ بھی سمجھتا ہے کہ ہاں۔ بے شک اگر ان کا علاج نہ کروں اور کہیں

جاؤں تو پھر یہ نہیں بچے گا مریض...... تو اب یہ منہ مانگے دام اُس کے تئیں...... اپنے فن کے...... کہ اتنا کچھ دو تو میں علاج کروں گا۔ تو یہ ڈاکٹر ہونے کے لحاظ سے تو صحیح ہے پیشے کا گویا عقلی تقاضہ ہے وہ جس کا نام دنیا میں عقل ہے اُس کے لحاظ سے پیشے کا تقاضہ یہی ہے اگر اس نے معمولی فیس کے اوپر علاج کر دیا تو دُنیا کی نظر میں بے وقوف ہے۔ یہی تو وقت تھا زیادہ سے زیادہ پیسہ حاصل کرنے کا یہ تو ہے ڈاکٹر ہونے کا تقاضہ لیکن مسلم ہونے کا تقاضہ کیا ہے۔ مسلم ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر ایسا مریض ہوتا کہ آپ سمجھتے کہ ہر ایک علاج کرے گا تو آپ جتنے چاہتے کہہ لیتے۔ اس کا اقرار لے لیتے کہ میں اتنا لوں گا۔ تو دُنیا چاہے آپ کو بے وقوف کہتی لیکن اسلام دامن گیر نہ ہوتا۔ لیکن جب آپ نے سمجھ لیا کہ سوا میرے کوئی اس کی جان نہیں بچا سکتا۔ تو اب اس کا علاج کرنا آپ پر واجب عینی ہے...... اب آپ کا فریضہ ہے کہ اس کا علاج کیجئے اب اس ذیل میں کچھ وصول ہو جائے تو ہو جائے۔

لیکن اگر آپ مول تول میں رہ گئے اور اُس کی جان چلی گئی تو قاتل نفس آپ قرار پائیں گے۔ اب دیکھنا ہے کہ کون فقط ڈاکٹر ہے اور کون مسلم ڈاکٹر ہے اسی طرح سے اگر آپ تاجر ہیں تو اگر فاضلات زندگی کے تاجر ہیں فرنیچر کے آپ۔ اگر کاروبار کرتے ہیں اور جو آجکل کی ضروریاتِ زندگی بن گئے ہیں۔ ہر گھر میں جو کھاتی پیتی زندگی کا جزو ہیں بلکہ کھانے پینے میں دشواری ہو تب بھی تو ان میں سے ہے کہ ہر گھر میں موجود ہے تو اس کے تاجر ہیں آپ تو تو جو چاہے دُنیا کی حکومتیں اُس کی قیمت مقرر کر دیں اور وہ سدِ راہ ہوں لیکن اسلام سدِ راہ نہیں ہوتا۔

آپ مختار ہیں۔ جتنی چاہے قیمت اپنے مال کی مقرر کریں۔ ہاں اصول تجارت کے تحت ظاہر ہے کہ آپ کو وہی قیمت لینا ہوگی کہ کوئی آپ سے لے۔ ورنہ اب اگر غیر معمولی قیمت بتائی تو کہیں اور سے جا کے لے گا۔ تو وہ۔ وہی غیر عاقلانہ عمل ہوگا۔ مگر اسلام کو اس

میں کوئی مزاحمت نہیں ہے۔ جتنی چاہے آپ قیمت اپنے (پیسے) سال کی مقرر کر دیجئے اور جتنا چاہے آپ لیجئے۔

لیکن اگر ضروریات حیات کے تاجر ہیں جن میں سب سے زیادہ غلہ ہے کہ بغیر غلے کے انسان کو رزق ملنا ناممکن ہے عموماً...... تو جناب عالی اگر ضروریاتِ حیات کے تاجر ہیں تو اگر دور ایسا ہے کہ فراواں ہے ایک جنس...... بازار میں پٹی (بھری) پڑی ہے ہر جگہ تو یہاں وہی پیشے کا تقاضہ یہ ہے کہ اب یہ وقت نہیں ہے زیادہ قیمت وصول کرنے کا۔ کیونکہ ہم یہاں مہنگا بیچیں گے تو وہ کہیں اور سے لے گا تو یہاں پیشے کا تقاضہ یہی ہے کہ جو عام بھاؤ ہے وہ لے لیں۔

لیکن اگر وہ ضروریاتِ حیات جنس نایاب یا کم یاب ہوگئی۔ غلہ مفقود ہے۔ قحط کا۔ قحط سالی کا زمانہ ہے۔ آپ نے کچھ حسن انتظام سے ذخیرہ کر رکھا ہے کہ جسے خریدنا ہو آپ ہی کے ہاں سے خریدے کہیں اور سے نہیں لے سکتے۔ تو جناب والا اب پیشے کا تقاضہ یہ ہے کہ یہی وقت ہے زیادہ سے زیادہ وصول کرنے کا اور اتنی وصول یابی سے جو ماشاءاللہ بڑھ جاتے ہیں۔ وہ پھر حذا من فضل ربی لکھتے ہیں۔ تو وہ حذا من فضل ربی والی آمدنی وہ بکثرت (بے شک بے برکت) ہو جائے گی۔

مگر اسلام کیا کہتا ہے کہ اگر فراواں ہوتا تو ہر جگہ سے آدمی لے سکتا۔ تو تمہیں اختیار تھا جتنی چاہے قیمت وصول کرتے، خود مقرر کرتے قیمت اپنے مال کی۔ لیکن جس وقت میں کہ قحط سالی ہے...... انحطاط ہو گیا۔ اب تمہارے سوا کہیں سے وہ ملے ہی گا نہیں۔ تو اب مستقل اُس جنس کو روکنے والا...... قیمت بڑھانے کے انتظار میں وہ لعنت خدا کا حقدار ہوگا۔

اب تو تمہارا فریضہ ہے کہ اُس جنس کو لے آؤ اور ہمارے رہنمایانِ دین نے عمل کی زندگی میں ہمیشہ اپنا درجہ عام قانون کے اصول سے اور سخت تر منزل پر رکھا کہ ماشاءاللہ صاحب علم بھی ہیں تو یہ احتکار کا مسئلہ تجارت میں ہے لیکن کوئی شخص اپنے ضروریاتِ زندگی

کے لیے حسن انتظام سے کام لیکر اپنے اور اپنے اہل و عیال کی آزوقے کے لیے غلہ فراہم کرے اور اسے محفوظ کر لے تو اس پہ اسلام پابندی عائد نہیں کرے گا۔ لیکن عوامی قانون کے لحاظ سے پابندی نہیں ہو گی جو رہنمایان دین ہیں۔ انہوں نے اپنے عمل سے جو تعلیم دی ہے وہ یہ کہ...... امام جعفر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں مدینے میں قحط پڑا اور لوگ دانے دانے کو گویا حیران و پریشان ہو گئے۔ آپ نے اپنے مہمان خانے کے منتظم سے گویا باورچی خانہ جس کے ہاتھ میں تھا۔ اُس سے بلا کے فرمایا...... دریافت فرمایا کہ ہمارے اس وقت۔ ہمارے ہاں کتنا اناج ہے۔ کتنی گیہوں موجود ہے کتنی جنس موجود ہے۔ وہ سمجھا کہ حضرتؑ کو فکر ہے کہ کہیں ہمیں پریشانی نہ ہو تو اُس نے بڑے اطمینان کی سانس لے کے کہا کہ حضور ہمارے ہاں اتنا ذخیرہ ہے کہ ہم اس فصل کو بہ اطمینان گزار لے جائیں گے حضرت نے فرمایا کہ ہاں۔ اسی لیے میں نے معلوم کرنا چاہا تھا کہ اب کل اس کو بازار میں لے جانا اور سب غلے کو فروخت کر دینا۔

اس کے ہوش اُڑ گئے۔ بالکل اصولِ معاشیات کے خلاف...... اُس نے کہا "حضور ہمیں بڑی پھر پریشانی پیدا ہو جائے گی، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں" آپ نے ارشاد کیا کہ یہی تو میرا مطلب ہے کہ تم بازار میں لے جاؤ۔ فروخت کر دو۔ تاکہ پھر جس حال میں سب مسلمان ہیں۔ اُس حال میں ہم بھی ہو جائیں پھر جتنے کو سب خریدیں گے اتنے کو ہم بھی خریدیں گے۔ مگر میں نے عرض کیا کہ جو عوامی قانون ہے۔ سب کے لیے جو اصول ہیں۔ اس میں یہ کوئی ضروری بات نہیں تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن سامط کی تعلیم پیچھے ہوتی ہے اور قرآن ناطق کا عمل آگے آگے جاتا ہے۔

تو یہ دیکھنا ہے اب کہ کون تاجر ہے اور کون مسلمان تاجر ہے اور اگر مثلاً کوئی صاحب ماشاءاللہ وکیل ہیں۔ تو اگر صاف مقدمہ آیا۔ بالکل قرآئن سے ثابت کر دینا بہت آسان۔ تو اُس وقت میں پیشے کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ وقت زیادہ وصول کرنے کا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو جیتا

ہو جیسے مقدمہ ہے بالکل قرآن کے لحاظ سے ثابت۔ لہٰذا میں پیروی نہ کروں گا۔ کوئی دوسرا کرے گا۔ تب بھی اس کا مطلب نکل جائے گا۔ لہٰذا اب زیادہ مول تول کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اب ان کی زبان میں بات کر رہا ہوں کہ بالکل بے جان مقدمہ ہے بے جان مقدمے کا کیا مطلب۔ یعنی ان کے نقطہ نظر سے بالکل جھوٹا ہے۔ تو اب پیشہ یہ کہتا ہے کہ یہی وقت ہے زیادہ سے زیادہ کمال فن ثابت کرنے کا۔ کہ بے جان کو جان دار بنایا جائے اور اب اسلام کا کیا تقاضا ہے؟ کہ اگر تم نے ناحق کو حق بنانے کی کوشش کی تو باطل پرست ہو گئے۔ پھر حق پرست نہیں رہے۔ لہٰذا ایسا مقدمہ ہی لیا نہ جائے جسے تم سمجھتے ہو کہ یہ بے جان ہے یعنی حقیقت کے بالکل خلاف ہے تو اب وصول کرنا۔ زیادہ یا کم۔ کم بھی وصول کرو گے تو حرام ہو گا۔ وہ عمل ہی۔ وہ وکالت ہی اس مقدمے میں تمہارے لیے ناجائز ہے۔ اب کتنا مشکل مسئلہ ہو گیا...... کہ کون وکیل ہے اور کون مسلمان وکیل ہے اور یاد رکھیے کہ جو ایسا وکیل ہو گا۔ جو میرے کہے ہوئے اصول کا پابند ہو۔ تو وہ تو ناکام ہی وکیل ہو گا عام زبان میں ناکامیاب...... ناکامیاب وکیل۔ یعنی زندگی میں نہ کچھ کمائے گا زیادہ نہ کچھ...... اور نہ کچھ اس کے ہاں بھیڑ بھاڑ نظر آئے گی اور لوگ آئیں گے ہی نہیں کہ صاحب کہ لیتے ہی نہیں مقدمے شاذ و نادر...... اور وہ بھی کوئی صاف مقدمہ ہوتا ہو۔ تو لے لیتے ہیں۔ تو فائدہ کیا ہے ایسے وکیل سے...... تو یہ وکالت ان کی بالکل ناکامیاب ہو گی۔ صرف حق پرستی کی وجہ سے...... تو ایسے ہی کرسی حکومت پر کوئی آ جائے حق کا پابند رہ کر۔ دنیا کہے گی کہ حکومت ناکامیاب......

وہ خود بھی یہ کہے گا۔ مختصر الفاظ میں وہی۔ جس کو پھیلا کے میں اتنی دیر میں کہہ رہا ہوں کہ ارے اگر دین نہ ہوتا۔ تو کامیاب ترین سیاست دان میں ہوتا۔ مگر کیا کروں کہ میرے پیروں میں تو دین کی زنجیریں پڑی ہیں۔ تو اب دین کے تقاضے ہر شعبہ حیات میں ہیں اور جناب میں نے عرض جو کر دیا۔

مجمع میں وکیل بھی ہوں گے وہ کہیں گے ہم پر ضرب پڑ گئی۔ ہم پر ضرب پڑ گئی...... ممکن ہے ڈاکٹر صاحب ہوں وہ کہیں کہ ہم پر ضرب پڑ گئی...... تاجر چھوٹے بڑے وہ کہیں گے کہ ہم پر ضرب پڑ گئی...... تو میں اپنی صنف کو کیوں چھوڑوں۔ جب سے مثلاً مولوی مطلب ہے ایک پیشہ ہو گیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ مولوی صاحب میں بھی ایک تفریق ہے یہ دیکھنا ہے کہ فقط مولوی ہے یا مسلمان مولوی ہے۔ اگر کوئی استفتاء آیا۔ کوئی مسئلہ شرعی دریافت کیا اور میں نے بس یہ دیکھا کہ واقعی اس میں کیا حکم شرع ہے اور بلا تکلف میں نے لکھ دیا۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں مسلمان مولوی ہوں اور اگر کوئی استفتا آیا اور فوراً میرے ذہن میں آیا کہ اس کا جواب جو ہے وہ بڑے آدمیوں میں سے کس کو ناپسند ہوگا؟ اور کس کے مفادات کو اس سے ضرب لگے گی؟ کون مجھ سے خفا ہو جائیں گے۔ اگر یہ سب میں نے لحاظ کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں فقط مولوی ہوں مسلمان مولوی نہیں ہوں اور اسی طرح سے فرض کیجئے کہ اب...... اب تو دونوں چیزیں شاید مترادف ہو گئی ہیں لیکن جو مفہوم کے لحاظ سے ذاکر بھی ایک الگ چیز ہے یہ بھی ایک پیشہ ہے اگر میں ذاکر ہوں اور میں نے منبر پہ آکر یہ دیکھا کہ حق کیا ہے اور حقیقت کے ثبوت کے کیا طریقے ہیں اور خلق خدا کے لیے مفید اور کارآمد باتیں کیا ہیں اور جب مجھے خدا نے قوتِ گویائی دی ہے تو میں ان باتوں کو پیش کروں۔ جو خلق خدا کے لیے فائدہ رساں ہیں۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں بہرحال مسلمان ذاکر ہوں۔

اور اگر منبر پر آکر یہ میں نے دیکھا کہ مجمع کس چیز سے زیادہ خوش ہوگا؟ اور واہ واہ کس میں زیادہ ہوگی اور نعرے کس میں زیادہ زوردار لگیں گے۔ یہ سب میں نے اگر لحاظ کیا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بس ذاکر ہوں۔

تو اب یہ چند باتیں بطور مثال میں نے عرض کی ہیں کہ اسلام درحقیقت ایک روح ہے جو ہر شعبہ حیات میں کارفرما ہوتی ہے اور وہ رُوح اس کا ایک دوسرا نام ہے یادالٰہی اور

دوسرے مذاہب سے اور اسلام سے یہی فرق ہے۔ دنیا میں اللہ یاد کیا جاتا ہے اور اسلام میں اللہ یاد رکھا جاتا ہے۔

بس آپ ڈاکٹر ہیں...... مگر اللہ کو یاد رکھیے...... آپ حکیم ہیں...... اللہ کو یاد رکھیے...... آپ تاجر ہیں...... اللہ کو یاد رکھیے۔ آپ فرض کیجیے کہ وکیل ہیں تو اللہ کو یاد رکھیے۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ فرائض کو یاد رکھنا...... ان فرائض کو جو اُس کی طرف سے آئے ہیں انہیں یاد رکھنا۔ اُسی کا نام ہے۔ اسلام کے عملی تقاضوں کو پورا کرنا۔ لہٰذا اسلام تمام شعبہ حیات میں کارفرما ہے اور اس لیے اسلام میں...... میں تفریق نہیں کرسکتا کہ فلاں آدمی اس حد تک مسلمان ہے اور یہاں پر سے بس آدمی ہے۔ تقسیم نہیں کرسکتا۔ کسی مسلمان کی کہ کہاں تک وہ آدمی ہے اور کہاں تک...... مسلمان ہے۔

اگر وہ مسلمان ہے تو مسلمان آدمی ہے۔ آدمیت سے اس کا اسلام الگ نہیں ہے۔ شعبہ حیات سے ہی نہیں ہوتا اسلام۔ تو پھر کسی وقت پر بس آدمی رہ جاتا۔ اب مسلم نہ ہوتا۔ لیکن جب سے ہر شعبہ حیات انسانی میں اسلام کارفرما ہے۔ تو کسی مسلمان کا بٹوارہ نہیں ہو سکتا۔ تو جب مسلمان کا بٹوارہ نہیں ہوسکتا تو پیغمبر اسلام کا میں بٹوارہ زندگی کا مان لوں گا؟ کہ کہیں پر سے صرف وہ رسولؐ ہیں اور کہیں پر وہ عام بشر ہیں۔ مسلمان اگر مسلمان ہے تو بیرونی زندگی میں بھی مسلمان ہوگا...... اندرونی زندگی میں بھی مسلمان ہوگا...... باہر کی زندگی میں بھی مسلمان ہوگا...... گھر کی زندگی میں بھی مسلمان ہوگا...... یعنی وہ تو میں نے پیشے کہے تھے اور نظامِ انسانی کے لحاظ سے اور جو آپ تقسیم کرلیں یعنی شوہر ہے تو مسلمان شوہر ہوتا ہے اور زوجہ ہے تو مسلمان زوجہ ہوتا ہے اور باپ ہے تو مسلمان باپ ہوتا ہے اور بیٹا ہے تو مسلمان بیٹا ہوتا ہے۔ یہ ان رشتوں میں بھی وہی روح کارفرما ہے۔ کیونکہ رشتے بھی حیات انسانی سے متعلق ہیں...... اور اسلام وہ رُوح ہے جو ہر شعبہ حیات انسانی میں ہے۔ یعنی باپ کی محبت بیٹے کے ساتھ...... اُس کے تقاضے ہمیں معلوم ہیں لیکن اُس محبت کے تقاضے

اگر ٹکرا جائیں احکام الٰہی سے۔ تو کتنے ہی بے درد کہلایئے۔ مگر اب باپ کے تقاضے پورا کرنا حرام...... جو حق پرستی کے تقاضے ہیں۔ انہیں پورا کیجئے۔ اگر شوہر نامدار ہیں تو مجھے دونوں رُخوں پر۔ جیسے بیوی کے مقابلے میں وہ احساس برتری کا شوہر کو جو حق ہوتا ہے۔ اُس سے کام لیکر حق سے تجاوز کیا تو عملاً مسلمان نہ رہے اور اگر بیوی کی خاطر داری کے لیے خلاف حق کر دیا...... تو عملاً مسلمان نہ رہے...... یعنی یہ وہ منزل ہے کہ درمیان میں تختہ بند ہیں کہ اُدھر حرکت کریں تو حق سے تجاوز کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ ادھر حرکت کریں تو حق سے تجاوز کے مرتکب ہو سکتے ہیں...... نہ بیوی پر اپنے شوہر ہونے کا رُعب ڈال کے کوئی ناروا بات کرنا جائز اور نہ بیوی کی خاطر سے کوئی بات ایسی کرنا۔ جو حق کے خلاف ہو۔ وہ جائز اور یہ منزل بڑی سخت۔ بہت مشکل منزل۔ مگر یہ کہ دیکھنا ہے کہ کون بس شوہر ہے اور کون مسلمان شوہر ہے۔ تو کسی شعبہ حیات سے اسلام الگ نہیں ہے۔ تو جب کسی شعبہ حیات سے الگ نہیں ہے۔ تو پیغمبر اسلام ﷺ کسی شعبہ حیات میں رسالت سے الگ کیونکر ہو سکتے ہیں یعنی یہ باپ ہیں تو رسولؐ باپ ہیں اور ہمسایہ ہیں اور اسی لیے خالق سند عطا فرمائے گا کہ انک علٰی خُلُقٍ عظیم۔ آپ عظیم معیار اخلاق یعنی معیار فرائض انسانی کے بلند ترین درجے پر ہیں۔

اور اب یہ سیرت النبی کا موضوع ہے اس وقت تفصیل سے عرض نہیں کرنا ہے کہ اخلاق کا دائرہ ہماری زبان میں محدود ہو گیا ہے۔ مگر قرآن کی زبان میں اور عربی میں اخلاق جو ہے۔ ہر شعبہ حیات انسانی میں جو انسان کے جو اوصاف نفیسہ ہیں۔ ان سب کا مجموعہ ہے اخلاق۔ یعنی باپ کا برتاؤ بیٹے کے ساتھ وہ بھی داخل اخلاق اور شوہر کا برتاؤ زوجہ کے ساتھ وہ بھی داخل اخلاق اور ایک ہمسائے کا ہمسائے کے ساتھ برتاؤ۔ وہ بھی داخل اخلاق اور بجائے خود آدمی کے اچھے اوصاف۔ جو بحیثیت انسان اس میں ہونا چاہئیں وہ بھی وہ مقتضائے اخلاق۔ تو اب سمیٹ کر اس کا نتیجہ عرض کروں کہ اپنے رسولؐ کو جو خالق نے یہ کہا کہ انک علٰی خُلُقٍ عظیم۔ اے پیغمبرؐ۔ آپ عظیم خلق کے درجے پر فائز ہیں اور یاد رکھیے

کہ کوئی چھوٹا کسی چیز کو بڑا کہے تو وہ بڑے ہونے کی سند نہیں ہے۔

لیکن اللہ اکبر...... جو ہر بڑے سے بڑا ہے۔ وہ میں کہتا ہوں کہ دنیائے اخلاق میں آدم سے لیکر خاتم تک اپنی نگاہ خوبی سے جائزہ لیکر وہ ایک خلق کو عظیم کہہ رہا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے بشر میں اس سے آگے عظیم خلق کا تصور ملتا ہی نہیں کہ جسے خالق نے خلق عظیم کہا تو اب اسے سب کو پورے شعبہ اخلاق رسولؐ کو سمیٹ کر میں اس آیت کی تشریح کروں۔ تو میں کہتا ہوں کہ خالق نے کہا کہ آپ عظیم خلق کے درجے پر فائز ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی اولاد کے لیے آپ سے بہتر کوئی باپ بھی نہیں۔ اپنی ازواج کیلئے آپ سے بہتر کوئی شریک حیات بھی نہیں اپنے ہمسایوں کیلئے آپ سے بہتر کوئی ہمسایہ بھی نہیں۔ اپنے محکوموں کیلئے آپ سے بڑھ کر کوئی حاکم بھی نہیں اور اپنے اللہ کا آپ کی طرح کا کوئی بندہ بھی نہیں۔

تو اب جبکہ دین ہمہ گیر ہے جبکہ دین کسی ایک شعبہ حیات سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ جتنے زندگی کے شعبے ہیں اُن سب سے دین متعلق ہے۔ تو اسی لیے قانون دین یعنی شریعت اسلام بھی کسی ایک شعبہ حیات سے۔ کسی ایک میدانِ زندگی سے متعلق۔ محدود نہیں ہے۔ اسی سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ پورا نظامِ حیات وہ در حقیقت شریعت کے حدود کے اندر ہے۔ کوئی نہ کوئی حکم شرع اس کے لیے موجود ہے۔

اب وہ واجب ہو۔ حرام ہو۔ مستحب ہو۔ مکروہ ہو۔ مباح ہو۔ اتنی قسم کے احکام۔ شریعت کے ہوتے ہیں نا۔ تو کوئی آپ کا عمل نہیں ہو سکتا۔ جو ان احکام کے دائرے سے باہر ہو۔ کہ کوئی کہے کہ جی اس کا شریعت سے کیا تعلق۔ کیا شریعت کے ساتھ۔ یعنی یہ پوچھنا کہ یہ واجب ہے۔ حرام ہے مستحب ہے۔ مکروہ ہے۔ مباح ہے کیا۔ کچھ نہیں۔ اس کا شریعت سے کیا تعلق؟

ارے جناب شریعت سے بایں معنی تعلق نہ سہی کہ واجب نہ ہوگا۔ ایں معنی تعلق نہ سہی کہ حرام نہ ہوگا۔ یعنی وہ لازمی پابندی وہاں پر نہیں ہوگی لیکن یہ کہ شریعت سے کوئی تعلق

ہی نہیں...... کم سے کم یہ تو دیکھنا ہے آپ کو یہ جائز ہے یا نا جائز ہے تو وہ سب قسمیں ہیں۔ واجب اور مستحب اور مکروہ اور مباح۔ یہ سب جائز کی قسمیں ہیں اور نا جائز کے معنی حرام کے ہیں۔ تو اب جو حرام کے دائرہ میں ہو تو وہی شرع سے متعلق ہے۔ نہیں۔ کوئی تو عمل آپ کا ایسا نہیں۔ جس کا کوئی نہ کوئی حکم شریعت میں نہ ہو۔ جتنے احکام شریعت کے ہیں۔ ان کا دائرہ آپ کی پوری زندگی پر حاوی ہے اور کوئی زندگی کا آپ کے عمل...... جزوی سے جزوی' وہ ایسا نہیں...... فرض کیجئے کہ آپ اپنی جگہ پر بیٹھ کے صرف اپنے ہاتھ کو گردش دیا کریں۔ کوئی کہے کہ شرع میں اس کا کیا حکم ہے۔ اب شرع سے اس کا کیا تعلق؟ یہ نہیں ہے۔ اسے بھی دیکھنا ہے کہ یہ جائز ہے یا نا جائز ہے۔ اپنی جگہ پر بیٹھ کے آپ ذرا گردش دیا کریں ہاتھ کو۔ جائز ہی ہوگا اگر نماز کی حالت میں آپ نے مسلسل ہاتھ کو گردش دی تو یاد رکھیے کہ فعل قلیل بھی کثرت کی صورت میں کثیر بن جائے گا۔ تو وہ مبطل نماز ہو جائے گا۔ تو اب آپ سمجھتے ہیں کہ اس کا ہاتھ ہلانے کا کوئی حکم ہی نہیں تھا شرع میں...... جی نہیں وہ اپنی جگہ ہوتا تو بھی حکم تھا...... مباح تھا اور اب اگر نماز کی آیت کے اوپر وہ اثر انداز ہے۔ تو جو حکم اس کے لیے ہو گا۔ حرام ہو گیا۔

یہ آپ کا کلام...... اس کا بھی کوئی نہ کوئی حکم...... یہ زبان کی گردش ہے...... ہاتھ کی گردش تو دکھائی بھی دیتی ہے لوگوں کو...... یہ زبان کی معمولی سی گردش...... یہ چھوٹا سا جزو...... او ہو۔ اس کے ساتھ تو اتنے احکام کا تعلق ہے۔ زبان کی گردش ہوئی اور اس نے فساد پھیلا دیا۔ تو یہ دیکھ لیجئے کہ زبان حرام ہے۔ کتنی بڑی حرام کہ وہ فساد پھیلانے کا مصداق بن گئی ہے۔ یہ گردش زبان جس نے خلق خدا کو گمراہ کر دیا۔ تو اب یہ آدمی مضلین میں گمراہ کرنے والوں میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی زبان کی گردش سے...... کتنے بڑے شعبے حلال و حرام کے متعلق ہو گئے۔

تو جناب کوئی جزو ایسا نہیں کہ جو حدود شریعت کے باہر ہو۔ کوئی چیز ایسی نہیں۔ کوئی

گردش وسکون نہ جنبش۔ نہ سکون۔ کوئی بھی قسم افعال انسانی کی ایسی نہیں ہے جو حدود شریعت سے باہر ہو۔

مگر بس۔ اب وہ وقت نہیں کہ فرق عرض کروں کہ اسی شریعت کے احکام کو جب مدون شکل میں لے آیا جاتا ہے یعنی خود سمجھ کے۔ کہ کیا کیا حکم ہیں۔ ان کو جمع کرلیا جاتا ہے تو اس کا نام فقہ ہو جاتی ہے۔ فقہ کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ احکام شریعت کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ اس لیے فقہ کے ابواب آپ دیکھئے کتنے وسیع۔ اب اس کی قسموں کو اس وقت عرض نہیں کرنا ہے۔ بات بہت پھیل جائے گی۔ تو انشاللہ ممکن ہے کل عرض کروں۔

فقہ اسلام۔ تو اس کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ وہ بھی۔ اُس سے بھی۔ جیسے شریعت سے کوئی شعبہ حیات کا خارج نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے فقہ سے کوئی شعبہ خارج نہیں ہوتا۔ لیکن کم سے کم۔ جس فقہ کا میں علمبردار ہوں۔ اس سے اس وقت بحث نہیں کہ نام اس کا کیا دنیا نے رکھ دیا ہے اور حقیقت میں کیا کہنا چاہیے اسے بھی اس وقت نہیں عرض کرنا ہے۔ مگر یہ کہ۔ یہ فقہ جس کو میں جانتا ہوں۔ بھئی دنیا کی فقہ کا ذکر نہیں ہے ہم جس فقہ کو اور میں کہتا ہوں کہ شرع الٰہی کا حامل جس فقہ کو جانتے ہیں۔ تو اس فقہ میں ہر معمولی سے معمولی شعبہ تو ہے۔ جس کی قسمیں ممکن ہے میں انشاء اللہ کل بیان کروں گا۔ مگر مجھے اس فقہ میں حکومت کا باب نہیں نظر آتا۔ ماشااللہ صاحبان علم ہیں۔ فقہ کی کتابیں بھی ان کے پاس موجود ہوں گی اس زمانے میں۔

گویا الگ الگ موضوع پر جس کو کہہ لیں کہ کاپیاں اس پر ہر شعبہ زندگی کے باب لکھتے تھے۔ تو پھر اس باب پر وہ کتاب لکھ دیتے تھے۔ وہی سب جمع ہو گئیں تو بڑی کتابیں بن گئیں۔ تو بعد میں وہ شاید سب کتابچے کے طور پر استعمال ہونے لگیں۔

لہٰذا شرائع اسلام۔ شرح جامع اور شرح کبیر قدیم وجدید جتنی کتابیں ہیں۔ ان سب میں دیکھئے۔ تو کتاب الطہارۃ۔ کتاب الصلوٰۃ۔ کتاب زکوٰۃ۔ کتاب الحج۔ کتاب الخمس۔ اسی

طرح سے ہیں۔ کتاب النکاح۔ کتاب التجارۃ۔ اب وہ قسمیں جو کل بیان کروں گا۔ انشاء اللہ فقہ کی...... زیادہ تفصیل نہیں۔

تو یہ آپ کو سب کتابیں نظر آئیں گی مگر پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ کتاب الامارۃ۔ کتاب الحکومۃ۔ یہ نہیں نظر آئے گی ہمارے ہاں تو چھوٹی سے چھوٹی فقہ کی کتاب۔ جیسے مختصر اندازے اور یا اُس سے بڑی جیسے شرح جامع شرائع اس سے بڑی شرح جامع۔ یہ گویا ہمارے ہاں کی اب چھوٹی کتابیں ہیں۔ ان چھوٹی کتابوں کا حجم بھی دنیا کی بڑی کتابوں کے برابر ہے اور بعض ان میں بڑی سے بڑی کتاب سے بڑی ہیں۔ جو دنیا کی کتابیں ہیں۔

چہ جائیکہ جواہر کلام اور الھدایہ۔ جو ایک ایک ہزار صفحے کی آٹھ آٹھ جلدیں اور چھ چھ جلدیں اور پانچ پانچ جلدیں ہیں۔ تو اتنی وسیع فقہ کی کتابیں ہیں کہ اگر دنیا انصاف کرے تو ماننا پڑے گا اُسے کہ جتنی تکمیل فقہ کی۔ علمائے شیعہ نے کی ہے اتنی دنیا کے کسی طبقے کے۔ کسی فرقے کے علماء نے اپنے قانون حیات کی اتنی تکمیل کے ساتھ تحقیق اور تنقید نہیں کی ہے۔ مگر وہ ایک ایک ہزار صفحے اور وہ تو ایک ایک جلد کے میں کہہ رہا ہوں۔ یعنی پانچ پانچ ہزار سمجھ لیجئے' چھ چھ ہزار صفحے کی جو کتابیں ہیں۔ اس میں مجھے کتاب الحکومہ نہیں نظر آتی۔ کتاب الامارۃ نہیں نظر آتی۔ اس کا فلسفہ کیا ہے؟

ماشاءاللہ صاحبان علم بھی ہونگے اور میں تو عام زبان میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ جو بھی فائدہ اٹھائیں۔ کہ یاد رکھیے کہ فقہ جو ہے وہ عام انسانوں کے افعال سے بحث کرتی ہے...... افعال مکلفین...... مکلفین کہتے ہیں عام مسلمان جن پر واجب وحرام کی پابندیاں ہیں تو افعال مکلفین سے بحث ہوتی ہے فقہ میں۔ یعنی عامہ خلائق کے کرنے کے جو کام ہیں۔ ان میں کون حلال ہے۔ کون حرام ہے۔ کون واجب ہے کون مستحب۔ کون مکروہ۔ کون مباح۔ میں نے کہا کہ کوئی جز ایسا نہیں جو شریعت کی حدود سے باہر ہو یا فقہ کی حدود سے باہر

ہو۔ مگر افعال خلائق...... مکلّفین کے افعال موضوعِ فقہ ہے اور ہمارے نزدیک ''حکومت'' خلقِ خدا کا کام تھا ہی نہیں۔ وہ خالق کا کام تھا۔ لہٰذا فقہ کا اس میں کوئی دخل ہی نہیں۔

افعال وہ ہیں۔ جو ہمارے کرنے کے ہیں اور افعالِ خدا جو ہیں ان کو...... وہ تو ہمارے ماننے کے ہیں حاکم ہمیں بنانا ہوتا تو فقہ میں آتا۔ کہ کسے حاکم بنائیں اور کسے نہ بنائیں۔ وہ بنانا ہمارا کام ہی نہیں تھا۔ وہ تو اس کی طرف کا حاکم ہوتا ہے وہاں ہمارا کام ہے سمجھنا کہ کون ہے اور یاد رکھیے کہ جہاں سمجھنا کام ہو۔ وہ اصولِ دین میں داخل ہوتا ہے فروعِ دین میں داخل نہیں ہوتا جہاں مقصد عمل ہو وہ فروعِ دین ہے اور جہاں مقصد سمجھنا ہو' ماننا ہو۔ وہ اصولِ دین ہے۔ اس لیے وہاں کام ہمارا سمجھنا ہے کہ کون اس کی طرف کا حاکم ہے۔ کچھ کرنا نہیں ہے تاکہ عالم صاحب سے آکر پوچھئے کہ اس کا حکم شرعی کیا ہے ہمارے عمل سے متعلق نہیں ہے وہ۔ تو اب کیا سمجھنا ہے۔

رسولؐ کے بارے میں ہمارا کیا کام ہے۔ معرفت حاصل کرنا۔ آخرت کے بارے میں کیا کام ہے اعتقاد کرنا کہ قیامت آنے والی ہے اور اسی طرح جو رہنمائے دین ہوں حق کے۔ اس کے بارے میں ہمارا کام ہے پہچاننا۔ سمجھنا تو اسی لیے۔ ہاں یہ حدیث یاد آگئی کہ من مات جاھلیہ۔

جو دنیا سے اُٹھ جائے اور اپنے امام زمانہ کی معرفت نہ حاصل کرے۔ تو اُس کی موت جاہلیت کی موت ہوئی۔ میں نے دیکھا ہے ہمارے اہل قلم اور اکثر مقررین بھی، ہاں، رواروی میں کہہ دیتے ہیں بالکل متفق علیہ...... ہر فرقہ اسلامی مگر میں کیا کروں کہ مجھے تلاش سے اہل سنت کی جوامع میں ان الفاظ میں یہ حدیث نہیں ملی۔ ہمارے ہاں تو تواتر ہے من مات ولم۔ انہی الفاظ میں لیکن میں نے تلاش کیا۔ تو مجھے جوامع میں جمہور امت کے ان الفاظ میں یہ حدیث نہیں ملی۔ صحیح مسلم کی حدیث یہ ہے نتیجہ وہ ممکن ہے کہ یہی نکلے کہ من مات...... جو مرجائے اور اس کی گردن میں کسی امامت کی' کسی امام کی بیعت کا حلقہ نہ ہو۔ صحیح

مسلم کی جو حدیث ہے۔ اُس کا لفظی ترجمہ کر رہا ہوں۔

من مات جو مر جائے...... کے معنی گردن کے...... اور اُس کی گردن میں نہ ہو کسی امامی بیعت کا حلقہ یا زنجیر یا پھندا یا جو چاہے کہہ لیجئے...... وہ جز مشترک ہے کہ وہ جاہلیت کی موت دنیا سے مرا۔ تو اب نتیجہ تو متفق علیہ ہو گیا تو اب جو امامت کو پابند رسم بیعت سمجھتے ہوں گے اُن کے ہاں یہ الفاظ ہوں گے اور جہاں رسم بیعت کوئی چیز ہی نہ ہو۔ وہ بس حقیقت کا ثبوت ہو۔ وہاں بس اتنا ہو گا کہ من مات ولم یعرف جو امام زمانہ کو نہ پہچانے۔ بیعت کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ بیعت کرنے ہی سے پھندا ہوتا ہے گردن میں۔ نبی کی بیعت نہ کریں تو وہ پھر معاف ہے؟ بیعت کرنا تو ایک رسم ہوتی ہے...... تو جناب والا نتیجہ بہر حال یہ ہے۔ اب ماشاءاللہ آپ کا ذوق تو...... انداز سماعت سے ظاہر ہے چاہے کتنے ہی غیر دلچسپ میرا بیان ہو۔ آپ اتنے ہی...... اتنے ہی ذوق وشوق سے سنتے ہیں تو یہ آپ کی محبت' وہ تو ظاہر ہے آپ کے انداز سے...... بہر حال ایک واقعہ یاد دلاؤں گا کہ میں ان کے نام وغیرہ سے کچھ نہیں واقف تھا اور نہ اُس کے بعد واقف ہوا۔ ایک دفعہ میں مسجد سے نماز پڑھ کر نکل رہا تھا کہ ایک نوجوان اور ایک اُن کیساتھ وہ دو آدمی مجھے ملے۔ ختم نماز کے بعد جب میں باہر آیا تو وہ ان کے ساتھی نے تعارف کرایا کہ یہ اکبر الہ آبادی کے بھانجے ہیں۔ ممکن ہے اُس خاندان کے کوئی افراد ہوں تو وہ سمجھیں کہ وہ کون نوجوان تھے۔ تو وہ کہا کہ اکبر الہ آبادی کے بھانجے ہیں اور یہ دائرہ شیعیت میں آگئے ہیں۔ تو ایسے لوگوں سے میں یہ ضرور پوچھ دیکھتا ہوں کہ کیوں؟ خوش نہیں ہو لیتا ہوں۔ پوچھتا ہوں کہ کیوں آخر' کیا وجہ ہوئی؟ کیوں؟ دائرہ شیعیت میں کیوں آئے۔

تو صاحب۔ انہوں نے جو واقعہ بیان کیا۔ اب آپ غور فرمایئے کہ وہ بہت سوں کی نظر سے گزرتا ہو گا کہ جنہوں نے یہ کتابیں پڑھی ہیں۔ سب کی نظر سے۔ مگر وہی۔ نجانے توفیق الٰہی کس کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ تو انہوں نے جو واقعہ بیان کیا۔ وہ میں عرض کرتا

ہوں اس پر کوئی تبصرہ جو ہے وہ نہیں کروں گا۔ بہر حال ایک نئی ہوئی بات ان سے......اور میں کہتا ہوں کہ دیکھئے ذہن......یعنی میرے ذہن میں اس سے پہلے یہ بات نہ تھی۔ جواب انہوں نے کہی۔ یعنی بحمد للہ۔ اس کے تقاضے کو تو مانتا رہا تھا۔ لیکن یہ کہ یہ رُخ استدلال کا۔ جس سے ان کی آنکھیں کھلیں وہ کہتے ہیں۔ انہوں نے بیان کیا مجھ سے کہ اکبر الہ آبادی مجھے عالم دین بنانا چاہتے تھے تو صحاح ستہ تک مجھے پڑھادیا اور صحاح ستہ کے لیے ایک معلم مقرر کیا۔ یعنی ان کو باقاعدہ معاوضہ دیا جاتا تھا اور ظاہر ہے کہ وہ خود ان صحاح کو پڑھے ہوئے تھے۔ ان کو روپیہ دیا جاتا تھا۔ تو وہ مجھے پڑھانے آتے تھے معلم، مولانا تو جناب میں صحاح ستہ پڑھ رہا تھا۔ تو میرے سامنے صحیح مسلم کی یہ حدیث گزری کہ جس کی گردن میں کسی امام کی بیعت نہ ہو تو اس کی جاہلیت کی موت ہوئی۔ یہ حدیث پڑھ لی۔ میرے ذہن میں کوئی خیال نہیں آیا۔ اب اسی صحاح ستہ میں یہ حدیث نظر آئی۔ جو سب جانتے ہیں کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنے دور کے صاحب اقتدار سے ناراض تشریف لے گئیں اور صحیح بخاری کی یہ حدیث ہے مسلم میں بھی اسی عبارت کا تذکرہ ہے کہ حضرت فاطمہؑ زہرا غضب ناک ہوئیں یہاں تک کہ دنیا سے اٹھ گئیں اور بات نہیں کی۔ یہ بھی حدیث میں......بس کہتے ہیں کہ بجلی کی رفتار سے میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا۔ میں نے استاد سے پوچھا کہ وہ حدیث رسولؐ کی ہم نے تو صحیح مسلم میں پڑھی تھی کہ جس کی گردن میں کسی امام کی بیعت کا حلقہ نہ ہو اس کی موت جاہلیت کی ہوئی۔ کہاں کہ ہاں وہ تو مسلم حدیث ہے اور میں پڑھا ہی چکا ہوں، تم پڑھ چکے ہو اور انہوں نے کہا کہ یہ بھی ظاہر ہے۔ یہ تو بخاری شریف کی حدیث ہے۔ بس کہتے ہیں کہ ایک دم سے میرے منہ سے نکلا کہ پھر حضرت فاطمہؑ کی موت کے بارے میں کیا سمجھنا چاہئے۔ بس یہ میرا کہنا تھا کہ وہ توبہ توبہ کرنے لگے......لگانے لگے اور کہنے لگے کہ یہ شیطان نے تمہارے ذہن میں خیال پیدا کیا۔ معاذ اللہ بی بی فاطمہؑ سیدۃ النساء اور ان کے بارے میں تم اس طرح کا تصور کر رہے ہو......توبہ کرو......انابت کرو

بارگاہِ الٰہی میں...... یہ کہتے ہیں میں نے کہا توبہ...... انابت کرلوں گا میں مگر مجھے سمجھایئے تو...... مگر وہ بس توبہ ہی کراتے رہے اور جب میں نے سوال کیا تو پھر یہ سب کہ تم لوگوں سے ملنے لگے ہو اور دوسروں کا اثر تم پر پڑنے لگا ہے اور مجھے کچھ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ میرے لیے اور کچھ بڑے علماء بلائے گئے اور میں نے کہا کہ یہ بس میرے ذہن میں یہ خیال خود صحاح ستہ کے پڑھنے سے پیدا ہوا ہے۔ تو میری تسلی بس کر دیجئے اور میرے اوپر واعظ و نصیحت کا کیا اثر ہے۔ وہ بات جو میری ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ کہہ دیا گیا کہ اس کا قلب سیاہ ہوگیا ہے اور یہ۔ اس کی ہدایت نہیں ہوسکتی اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اکبر الہ آبادی کے بڑے تعلق تھے۔ تعلقات تھے وہ مکاتب سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ مجھے پھر خواجہ حسن نظامی کے پاس بھیج دیا...... دہلی میں...... خواجہ صاحب کے ساتھ کئی برس رہا اور جب اُن سے یہ کہوں کہ جناب میرا وہ سوال تو حل ہوا ہی نہیں اور وہ آپ نے بھی آج تک اس کے متعلق کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ انہوں نے کہا ابھی اور مطالعہ کرو تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔ کہتے ہیں بس مطالعہ کرتے کرتے۔ ان کے نزدیک...... انہوں نے کہا تھا سمجھ آجائے گا...... تو میری سمجھ میں آگیا۔ اب وہ سامنے کی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے بہر حال وہ سب دیکھا تھا پہلے۔ لیکن یہ کڑیاں ملا کے۔ اس طرح سے ذہن گویا پوری طرح مرتب نہیں کیا تھا یہ قدرت کو جس کی ہدایت منظور ہوتی ہے۔ اس کو یہ خیال اس کے ذہن میں۔ قدرت کی طرف سے اس کو آتے ہیں۔

تو غرض یہ کہ اسی بناء کے اوپر ہمارے ہاں حقیقت کا تعلق بیعت سے نہیں ہے اور بیعت لینے والے۔ اب میں نے عرض کیا۔ اب پہلے ہی معذرت کر چکا کہ وقت بہت ہوگیا اور غالباً ضرورت سے زیادہ بیان ہوگیا۔ تو اب آگے نہیں بڑھنا چاہتا کہ اب یہ دنیا کہتی ہے کہ اتنے زمانے کے بعد کسی نے بیعت کرلی۔ کسی کو کہتے ہیں کہ وہ جو صلح نامہ ہوا۔ تب بیعت ہوگئی۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر کسی نے اس سلسلے میں سے بیعت کی ہوتی۔ تو حسینؑ کی

بیعت کے لیے اتنی طاقت نہ صرف کی جاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مدت سے دنیا میں صاحبان اقتدار کو حسرت تھی کہ ان میں سے کوئی بیعت کرے۔ یہاں تک کہ پوری طاقت صرف کر دی گئی حسینؑ سے بیعت حاصل کرنے کی کوشش میں کہ اب ہمیشہ کے لیے گویا راستے سے اس رکاوٹ کو دور کر دیا جائے۔

اور حضرت امام حسین علیہ السلام۔ دنیا کہتی ہے کہ کیا ہے؟ یہ انہوں نے بیعت کیوں نہ کی؟ میں کہتا ہوں کہ ان کے پیشرو بس یہی تھوڑی ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ آدم سے لیکر جتنا سلسلہ ہے۔ سب ان کے پیشرو ہیں تو کس نے اپنے دور کے۔ اپنے وقت کے صاحب اقتدار کی بیعت کی تھی اور آجکل کے تعلیم یافتہ مجمع پر تو ڈاکٹر اقبال کا نام بہت زیادہ اثر انداز ہے۔ میں کہتا ہوں ڈاکٹر اقبال کی زبان میں۔ انہوں نے جو کہا۔

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
ایں دو قوت از حیات آید پدید

وہاں نام تو خیر موسیٰ اور فرعون کا بھی لے لیا ہے۔ مگر بعد میں سب کو سمیٹ کر کہتا ہے کہ

زندہ حق از قوت شبیری است

اب موسیٰ کا نام نہیں ہے۔ اب حق زندہ ہے شبیری طاقت سے۔ اس کے معنی ہیں۔ جو موسیٰؑ میں کارفرما تھی۔ وہ بھی شبیری طاقت تھی۔ جو ابراہیمؑ میں کارفرما تھی۔ وہ بھی شبیری طاقت ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زبان اصطلاح اقبال میں ازل سے لے کے ابد تک جتنے حق پرست ہوں۔ وہ اپنے دور کے شبیر ہیں اور اس کے بالمقابل لازم ہے کہ جتنے باطل پرست ہوں یا جتنی طاقتیں باطل کی نمائندہ ہوں۔ سب اپنے دور کے یزید ہیں۔

تو اب اس محاورے کے سامنے رکھ کر میرے چند جملے جو اختصار کی بنیاد پر حفظ ہو سکتے ہیں وہ سن لیجئے اور اُسے محفوظ رکھیے کہ میں کہتا ہوں کہ کسی دور کے شبیر نے کسی دور کے یزید کی بیعت نہیں کی۔ تو بس اب یہ جملہ بھی محفوظ رکھیے کہ جب مجازی شبیروں نے مجازی

یزیدوں کی بیعت نہیں کی تو جو حقیقی شبیر تھا۔ وہ حقیقی یزید کی بیعت کیسے کر لیتا۔

بس اب جناب۔ بیعت نہ کرنا۔ وہ کسی کے لیے پھولوں کی سیج ثابت نہیں ہوتی۔ موسیٰ نے اپنے وقت کے یزید یعنی فرعون کی بات نہیں مانی۔ یعنی یہی انکار ہے بیعت سے۔ اس کی خدائی کو مان لیتے تو دشت نوردی کیوں اختیار کرنا پڑتی۔ تو یہ سمجھئے کہ اس جنگل میں جناب موسیٰ کی بھی وفات ہوئی اور اُسی جنگل میں جناب ہارون کی بھی وفات ہوئی۔

اور جناب ابراہیمؑ۔ اگر نمرود کی خدائی کو مان لیتے۔ تو آگ میں کیوں پھینکے جاتے اور پھر جلاوطن بھی ہونا پڑتا ہے شام وہ انکا وطن نہیں تھا۔ مصر گئے کیوں گئے۔ شام کا ملک تھا۔ تو وہاں جناب کئی کئی دفعہ جلاوطن کیے گئے اور آگ میں پھینکے گئے۔ یہ سب کیوں اُٹھانا پڑتا۔

اور پھر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اگر اپنے وقت کے یزیدوں کی بیعت کر لیتے تو کیوں پتھر جسم مبارک پر کھانا پڑتے۔ تو حضرت امام حسین علیہ السلام نے کوئی نیا کام نہیں کیا۔ انہوں نے وہی کام کیا۔ جو آدمؑ سے لیکر اب تک اُن کے پیش رو کرتے آئے۔ مگر پھر بھی میں یہ کہتا ہوں کہ واقعہ کربلا کی مثال نہ اولین میں ہے اور نہ آخرین میں ہے۔

کوئی کہے گا کہ یہ دونوں متضاد باتیں ہیں ابھی تو آپ نے کہا کہ انہوں نے کوئی نیا کام نہیں کیا وہی کیا۔ جو ہمیشہ ہوتا آیا۔ اب آپ کہتے ہیں کہ اس کی مثال نہ اولین میں ہے نہ آخرین میں۔ یہ دونوں متضاد ہیں میں کہتا ہوں کہ میں پہلی بات کو بھی بھولا نہیں ہوں۔ اس کو سامنے رکھ کے دوسری بات کہی ہے۔

بس معمولی بالکل اردو زبان کے دو جملے ہیں وہ شاید اصل حقیقت کو نمایاں کر دیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ انہوں نے کوئی نئی بات نہیں کی انہوں نے وہی کیا۔ جو ہمیشہ ہوتا آیا تھا۔ مگر ہوا ان کے ساتھ جو۔ وہ کبھی نہیں ہوا۔

یعنی ہمیشہ باطل کے دل میں حسرت رہ گئی کہ اگر اتنا اور کرتے تو شاید مقصد میں اپنے کامیاب ہو جاتے اور اسی کا دوسرا رُخ ہے کہ اہل حق کے متعلق غلط فہمی رہ گئی کہ اتنا

نہیں۔ اتنا تو سہہ لیا۔ اگر اتنا اور ہوتا۔ تو پھر برداشت نہ کر سکتے۔ بس یہ غلط فہمی حسینؑ نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دی۔

اب کوئی سوچ نہیں سکتا کہ اتنا اور کرتے۔ کیا رہ گیا کرنے کے لیے اور صابر کے متعلق یہ غلط فہمی نہیں ہو سکتی کہ اسے تو برداشت نہ کر سکتے۔ کیا رہ گیا۔ جسے برداشت نہ کر سکتے۔

ہاں اب ارباب عزا آج تیسری محرم کی ہے۔ جو خاص حال کی تو قید ہے نہیں۔ اس لیے میں بس آپ کے لیے چند جملے دفتر مصیبت ہونے کے لیے کافی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اور بات ہے کہ کسی مصیبت کے لیے مولا نے یہ نہ چاہا ہو۔ کہ میری آنکھوں کے سامنے ہو۔ علی اکبرؑ کے سینے پر برچھی لگتے دیکھ سکتے ہیں۔ عباسؑ کے شانے قلم ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ مگر زینب کے سر سے چادر۔ یہ اُترتے ہوئے۔ یہ منظور نہ تھا کہ یہ میں دیکھوں۔ مگر پھر بھی۔ اگر یہ قربانی مد نظر نہ ہوتی تو انتظام کر کے کیوں لاتے۔ دنیا والے تو کہہ رہے تھے کہ آپ جاتے ہیں تو بی بیوں اور بچوں کو کیوں لیے جاتے ہیں۔ مگر مولا اس وقت دنیا کو کیا جتاتے۔ کسی سے کہہ دیا کہ یہ رسولؐ کی امانتیں ہیں ان کو کہاں چھوڑ جاؤں...... کسی سے کہہ دیا کہ یہ میں نے رسول کو خواب میں دیکھا ہے انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ ان سب کو لیکر جاؤ...... ہر ایک کو اصل راز کہاں بتایا ہے...... بس اب یہ درمیان کا حال ہے اسی کو عرض کروں کہ جب مکے سے چل رہے تھے تو ابن عباس حاضر ہوئے۔ یہ عزیز تھے۔ رشتے میں چچا ہوتے تھے۔ جناب ابن عباس...... اسی لیے گھر کے اندر ہی پردہ کر کے انہیں بلا لیا گیا اور زینب کبریٰ پس پردہ تھیں۔ کیونکہ عزیز سہی۔ مگر شرعاً نامحرم تو تھے لہٰذا پس پردہ تھیں اور ابن عباس نے...... بڑے جہاں دیدہ، یہ تاریخ کہتی ہے کہ اس وقت کے شہرہ آفاق مدبرین میں چند آدمی تھے۔ جن میں سے چار اُدھر تھے۔ شام والوں کی طرف...... اور دو ادھر تھے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی اور اہل بیتؑ کی طرف سے۔ ان دو میں سے تھے جناب ابن عباس۔ بڑے جہاندیدہ۔ مدبر۔ سیاست دان۔ گویا دنیا ان کو مان رہی

تھی۔ جناب ابن عباس نے کہا۔ کہ اگر آپ جاتے ہیں۔ تو یہ عورتوں اور بچوں کو کیوں لیے جاتے ہیں۔ تو مولا نے ابن عباس کو کیا جواب دیا ترجمہ عرض کرتا ہوں...... تو مولا نے یہ فرمایا کہ ایک تو یہ کہ یہ امانت پیغمبر ہیں۔ ان کو کس کے سپرد کر دوں اور دوسری بات یہ ہے کہ محبت بھی انہیں مجھ سے اتنی ہے کہ یہ میرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔

آپ کے لیے میرے ہاں کم سے کم مصائب میں تیر و خنجر کے بیان ہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کم سے کم جملے ہی آپ کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کی قسم کہ آخر میں جو جملہ فرمایا اس نے زینبؑ کی ہمت بڑھائی۔ یعنی حضرت زینب نے جو یہ محسوس فرمایا کہ ہاں۔ ہماری محبت کا سہارا۔ بھائی اپنے مقصد کی تکمیل میں لینا چاہتے ہیں۔ اس نے ہمت بڑھائی۔ ادھر مولا خاموش ہوئے اور اُدھر پس پردہ سے آواز آئی۔ اے جناب ابن عباس۔ مجھے آپ سے یہ امید نہ تھی کہ آپ ہمارے بھائی کو یہ رائے دیں گے۔ کہ وہ چلے جائیں اور ہمیں یہاں چھوڑ جائیں۔ اور اس کے بعد شہزادی نے ایک عجب جملہ کہا کہ کیوں جناب عباس۔ کیا حسینؑ سے چھوٹ کے زینب زندہ رہ سکتی ہے۔ بس اب میں زیادہ نہیں عرض کروں گا۔ اپنی شہزادی سے عالمہ غیر معلمہ سے جلیل القدر شہزادی۔ میں اُن سے مخاطب ہو کر ان کی بارگاہ میں عرض کروں گا۔ کہ اے مخدومہ عالم۔ اے شہزادی ابھی یہ کہہ لیجیے کہ مولا کی مصلحت۔ فریضہ الٰہی اسی بات کا متقاضی ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ اس لیے کہہ لیجیے کہ حسینؑ سے چھٹ کے زینب زندہ نہیں رہ سکتی مگر اے بی بی۔ جب فرض کا تقاضا ہو گا۔ حکم الٰہی ہو گا۔ حسینؑ چلے جائیں گے اور آپ کو زندہ رہنا پڑے گا۔

......☆......

# مجلس چہارم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جَعَلْنٰكَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا

(جاثیہ:۱۸)

ترجمہ: ہم نے تم کو دین کے کھلے رستہ پر قائم کر دیا ہے تو اسی رستہ پر چلو جاؤ۔

دین اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے اور کسی بھی شعبہ حیات سے اس کا تعلق ختم نہیں ہوتا جو دین دار ہے۔ وہ اپنی اندرونی زندگی میں بھی دین دار ہے، بیرونی زندگی میں بھی دین دار ہے وہ اپنے معاشیات میں بھی دین دار۔ اپنے اخلاقیات میں بھی دین دار اپنے معاشرتی تعلقات میں بھی دین دار اور پھر اپنے سیاسیات میں بھی دین دار...... کوئی بھی زندگی کا شعبہ ایسا نہیں ہے جو دین کے حدود سے باہر ہو۔ اب دین کا جو عملی قانون ہے اور اُسی کا نام شریعت ہے۔ تو شریعت بھی کسی شعبہ حیات سے مخصوص نہیں ہوتی۔ بلکہ اندرونی اور بیرونی زندگی اور انفرادی اور اجتماعی زندگی وہ سبھی شریعت کے حدود میں ڈالی ہوتی ہے۔

اُس لحاظ سے فقہ اسلامی کے شعبے ہو گئے اُن کی جب فنی حیثیت سے تقسیم کی گئی تو وہ چار شعبے ہیں۔ یعنی پوری فقہ کو...... وہ تقسیم ہوئی تو اُس کے چار حصے ہو گے۔

(۱) عبادات۔ (۲) عقود۔

(۳) ایقاعات (۴) احکام

اب ہر آدمی کے لیے یہ غیر عام فہم باتیں ہیں۔ جو فقہ کی تعلیم حاصل کیے ہوئے ہوں وہ ہی اس کے معنی سمجھیں گے۔ مگر اس کی عقلی تقسیم کس بنیاد پر ہے۔ اسے جب میں عرض

کروں گا تو پھر بھی لوگ اس کو سمجھ سکتے ہیں اور پھر یہ بھی سمجھ لیں گے کہ انحصار بھی انہی میں ہے اب ان کے آگے کوئی بھی زندگی کا شعبہ۔ کوئی بھی باب انسانی طور پر ایسا نہیں ہو سکتا۔ جو اس دائرے سے باہر ہو اور اس کی تقسیم کی بنیاد جو ہے اور عقلی طور کے اوپر۔ ایک بات کہہ لیجئے کہ ہر زبان میں منطق پڑھائی جاتی ہے اب تو خیر انگریزی دان افراد بھی وہ چاہے اصطلاحیں بدلی ہوئی ہوں لیکن وہ بھی منطق پڑھتے ہیں۔

تو جہاں تلاش سے قسمیں مرتب کی جائیں وہاں تو گنجائش ہوتی ہے کہ ہمیں تلاش سے چار قسمیں ملیں۔ ممکن ہے کوئی پانچویں قسم بھی ہو۔ ان میں انحصار یقینی نہیں ہوتا۔ لیکن جو تقسیم ہاں اور نہیں کے اصول پر ہو کہ یا یوں ہے یا یوں نہیں ہے تو ہاں پر انحصار عقلی ہوتا ہے کہ اس کے آگے کوئی تیسری قسم نہیں نکل سکتی یعنی ثبوت ونفی۔ ایجاب وسلب اور ہماری زبان میں ہاں اور نہیں۔ اب اس کے علاوہ کوئی تیسری قسم کیا ہوگی۔ تو اب میں جو عرض کروں گا اس میں دیکھئے شرح منزل پر کہ ہاں اور نہیں آجاتا ہے تو اب اس کے بعد۔ آگے کوئی تیسرا شعبہ نہیں ہو سکتا۔ تو اب پہلی پہلی تقسیم تو یوں ہے ہاں اور نہیں کے طور پر۔ ثبوت ونفی کے طور پر کہ انسان کے جو افعال ہیں۔ وہ یا تو ایسے ہیں کہ اُن میں قربت الی اللہ کی نیت کی ضرورت ہے۔ بغیر نیت وہ عمل ہو ہی گا نہیں وہ عمل نہیں ہوگا صورت عمل چاہے ہو۔

مثلاً...... نماز...... بغیر نیت نہیں ہو سکتی۔ قربتاً الی اللہ کی نیت ضروری ہے۔ مگر شکل نماز ہو سکتی ہے۔ وہی تشہد پڑھے۔ وہی تمام اجزا جو ہیں۔ انہیں عمل میں لائے قیام بھی ہو۔ رکوع بھی ہو اور سجدہ بھی ہو۔ قنوت بھی ہر چیز جہاں نمازی اُٹھتا ہے۔ وہیں پر یہ اٹھے۔ جہاں نمازی بیٹھتا ہو۔ وہاں بیٹھے جہاں نمازی جھکتا ہو وہاں یہ جھکے جہاں سیدھا ہوتا ہے وہیں سیدھا ہو۔ لیکن اگر نیت نہیں ہے تو اٹھا بیٹھی ہے۔ نماز نہیں ہے۔ نماز وہی ہے جو قصد قربت سے ہو۔ نیت کے ساتھ ہو۔ یعنی یہ کام کی وقوع میں نہیں آئے گا۔ جو اس حقیقت سے واقف نہیں ہے وہ ہے کہ کسی نے فارسی میں کہا تھا کہ:

می شنم کہ نماز بغیر وضو نہ می شود

من     بارہا     کردم     لارئشہ

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ نماز بغیر وضو نہیں ہوتی میں نے بہت دفعہ پڑھی اور ہوگئی۔ وہ اس طرح کا ہو جانا اور بات ہے مگر حقیقت میں جس کا نام نماز ہے وہ بغیر ان شرائط کے نہیں ہوگی اور بغیر نیت کے نہیں ہوگی۔

اسی طرح روزے میں جتنی چیزیں چھوڑی جاتی ہیں وہ سب ترک انہوں نے کیں اور وہی شرعی حکم کے مطابق صبح صادق سے لے کر اور مغرب تک مگر نیت نہیں کی تو وہ فاقہ ہو گا۔ جس کا نام روزہ ہے وہ کام انجام نہیں پایا۔ اسی طرح سے سفر مکہ کیا۔ سب کچھ وہی کیا۔ خانہ کعبہ کا چکر بھی لگایا۔ گرد اس کے گھومے اور صفا اور مروئی کے درمیان دوڑ بھی لگائی اور میدان عرفات میں جا کے دن بھر چلچلاتی دھوپ میں ٹھہرے بھی رہے اور منیٰ میں جا کر کتنی محنت سے۔ ماشاللہ ریاضت کر کے بالوں کو پالا گیا ہو۔ سر کے بالوں کی پرورش جتنے بھی ذوق وشوق سے کی ہو۔ مگر اس قربانی کو بھی وہاں کرنا پڑا۔ یہ سب کچھ کیا۔ مگر قربۃً الی اللہ کی نیت سے کچھ نہیں تھا۔ اب وہ کیا ہو۔ کیا نیتیں دنیا میں ہوتی ہیں۔ اس سے مجھے غرض ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہے اور نیت نہیں ہے۔ تو سفر مکہ ہوا۔ لیکن ایک عدد حج نہیں ہوا۔ تو یہ وہ کام ہیں کہ جو وقوع ہی میں نہیں آسکتے قانون کی رُو سے۔ جب تک کہ نیت نہ ہو۔ تو اس قسم کے اگر کام ہیں کہ جن کے لیے نیت کی شرط ہے قربۃً الی اللہ کے قصد کی شرط ہے تو یہ باب کیا ہے؟...... اس کا نام ہے عبادات۔ اب اس کے مقابل میں دوسری قسم یہ ہے کہ نیت کی شرط نہیں ہے۔ تو وہی ہاں اور نہیں ہو گیا۔ یا نیت کی شرط ہے یا نیت کی شرط نہیں ہے۔

اگر نیت کی شرط ہے تو وہ عبادات ہیں اور اگر نیت کی شرط نہیں ہے تو پھر سے ایک تقسیم ہاں اور نہیں کے طور پر اور وہ یہ ہے کہ ان کے وقوع میں کوئی صیغہ ضروری ہے۔ یعنی کچھ الفاظ ہیں جو ادھر نیت تو صریح الفاظ نہیں ہے۔ وہ ہمارے ناسمجھ جو مولوی ہیں سمجھتے ہیں

کہ نیت ان الفاظ سے ہوگی نماز پڑھتا ہوں میں دو کہہ لیجیے یا تین رکعت پڑھ رہا ہوں قربۃ الی اللہ۔ یہ الفاظ گویا وہ سمجھتے ہیں۔ نیت یہ ہے اور اسی لیے آگے مسئلہ پوچھتے ہیں کہ جی نیت کرنا بھول گیا تھا تو یہ کیا ہے۔ کیا پوچھ رہے تھے کہ الفاظ کہنا حقیقت میں بھولے تھے۔ نیت اصل میں دل و دماغ میں اُن تصورات کا ہونا ہے اور نیت وہ محرک نفس ہے جو لاتا ہے مصلے پر یہاں بھولنے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اگر آپ کو علم نہیں تھا یا نماز کا ذہن میں تصور نہ تھا تو آپ خاص اس وقت پر مصلے پر آئے ہی کیوں۔ اگر آپ کو وضو کرنا نہیں تھا۔ نیت وضو کی نہیں تھی تو آپ نے یہ لوٹا اس خاص وقت پر کیوں اُٹھایا اور اس خاص وقت پر آپ نے یہ چلو کو کیوں منہ پر ڈالا۔ تو بس جس نے یہ کام کرایا' وہی نیت ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ نیت کچھ الفاظ کا نام ہے۔ نیت اُن الفاظ کا نام نہیں ہے ذہن میں اُس تصور کا ہونا ہے قربۃ الی اللہ کی...... لفظوں میں قربۃ الی اللہ کہہ رہے ہیں اور ذہن میں اللہ کے حکم کی تعمیل نہیں ہے۔ کسی اور کے خواہش کی تکمیل ہے یا کسی اور مقصد کی تکمیل ہے۔ جو میں نے کہا تھا' ہوا تھا۔ مگر قربتاً الی اللہ کی نیت سے نہیں ہوا۔ تو وہ ممکن ہے لفظوں سے ہوا ہو۔ اس نے' جس نے' بے چارے نے کسی اور کہنے سے حج کیا۔ اس نے بھی لفظی نیت تو کی تھی۔ احرام باندھا تھا تو اس وقت اس نے بھی وہی الفاظ کہے تھے قربتاً الی اللہ میں احرام باندھتا ہوں۔ لیکن ان لفظوں کا کہنا قربتاً الی اللہ کی نیت...... نہیں تھا۔ وہ تو دل کی گہرائیوں سے جو واقف ہو۔ وہی جانے کہ قربتاً الی اللہ ہے یا نہیں ہے وہی عالم الغیب سمجھے۔ اس لیے ہمیں کسی کے حج پر حکم لگانے کا بھی حق نہیں ہے کہ وہ تو جی قربۃ الی اللہ نہیں ہے۔ نمائشی ہے۔ آپ نے دل کو شگافتہ کر کے دیکھا' دماغ کا تجزیہ کر کے دیکھا کہ وہ قربۃ الی اللہ ہے یا نہیں۔ میں تو کلیے عرض کر رہا ہوں کہ اس کے بارے میں رائے نہیں قائم کر سکتا کہ کس کا عمل قربۃ الی اللہ ہے اور کس کا عمل قربۃ الی اللہ نہیں ہے۔ لیکن نیت تو الفاظ کا نام نہیں ہے مگر صیغے جس کا نام ہے وہ الفاظ کا نام ہے۔ وہاں قربۃ الی اللہ کی شرط نہیں ہے اُن معنوں کی نیت نہیں ہے۔ یعنی اگر انکحت

واقبلت کہہ کے رشتہ قائم کیا گیا۔ تو وہ رشتہ بہر حال عقد ہے' چاہے قربۃً الی اللہ کی نیت سے ہو یا باپ کے حکم سے ہو۔ چاہے وہ خواہش نفس کی تکمیل کے لیے ہو۔ خواہش نفس کی تکمیل کے لیے بھی ہے مگر انکحت و اقبلت کے الفاظ کے ساتھ ہے تو وہ قانونی ہے وہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ تو مادی غرض تھی ارے جناب مادی غرض سہی۔ مگر باضابطہ تھی' مادی غرض کی تکمیل اس نے ضابطے کے تحت میں کی ہے یہ تو نافہمیدہ ادراک ہے کہ کوئی کہے کہ اگر دائمی رشتہ ہے تو تو وہ واقعی کوئی مقدس چیز ہے اور اگر فرض کیجئے وقتی رشتہ ہے تو وہ تو خواہش نفس کی تکمیل ہے میں کہتا ہوں کہ دائمی رشتہ بھی خواہش نفس کی تکمیل ہو سکتا ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ باضابطہ ہے یا بے ضابطہ ہے اگر بے ضابطہ دائمی تعلقات ہیں، وہ بھی ناجائز اور اگر باضابطہ وقتی تعلق ہے تو وہ بھی جائز...... مگر بہر حال وہ الفاظ جب جاری ہوں تب قانون شرع کے مطابق صحیح ہوگا' بغیر اس کے صحیح نہیں ہوگا۔ ان الفاظ کا نام صیغہ ہے تو معلوم ہوا کہ نیت کی شرط نہیں ہے یہاں قربۃً الی اللہ کے قصد کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر صیغے کی ضرورت ہے بغیر صیغے کے وقوع میں نہیں آئے گا۔ وہ مادی مفادات پورے ہو جائیں گے مگر جس کا نام اس کی طرف سے زوجیت ہے وہ حاصل نہیں ہوگی قانونی طور پر وہ شوہر و زوجہ نہیں بنیں گے۔

تو جہاں صیغے کی ضرورت ہے تو اب وہی کہ کیا صیغے کی ضرورت ہے یا نہیں ہے۔ پھر وہی ثبوت وعدم آ گیا۔ جہاں قصد قربت کی نیت نہیں ہے وہاں اب یہ تقسیم آ گئی کہ یا صیغے کی ضرورت ہے یا صیغے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب وہ جو نہیں ہے اس کو الگ رکھیے۔ جہاں صیغے کی ضرورت ہے تو اب پھر اس میں دو قسمیں ہیں یا دو طرف صیغے کی ضرورت ہے یا ہے تو صیغے کی ضرورت' مگر دو طرفہ نہیں ہے۔ تو جہاں دو طرف ضرورت ہے یعنی اس کو کہتے ہیں ایجاب وقبول۔ ایک طرف سے ایجاب ہو' ایک طرف سے قبول، دو طرفہ صیغے کی ضرورت ہے یہ لاکھ کہے جا رہا ہے اس کا وکیل۔ انکحت انکحت اور وہ بولتا ہی نہیں قبلت۔ تو یہ

پوری تسبیح پڑھ ڈالے انحکت' انکحت کی اور زوّجتُ کی۔ مگر عقد وقوع ہی میں نہیں آئے گا
جب وہ ایک دفعہ کہہ دے قبلت تب عقد وقوع میں آئے گا۔

گویا طرفین سے ان الفاظ کی ضرورت ہے' وہ الفاظ صرف الفاظ نہیں' اس میں قصد
انشاء ہے یا نہیں قصد انشا کے معنی بھی بہت سے صاحبانِ علم' اب خواہ غلط فہمی سے یا دوسروں
کو گویا مرعوب کرنے کے لیے نہیں جناب! ہر ایک آدمی تھوڑی عقد پڑھ سکتا ہے اور قصد انشا
کتنی مشکل بات ہے۔ یعنی بغیر ہمارے وہ ہو ہی نہیں سکتا عقد آپ کا آپ لفظیں یاد بھی کر لیجیے
تحفۃ العوام میں دیکھ کر اور ممکن ہے وہ کسی مقصد سے۔

وہ ہیں ہی کتنے صرف اس میں۔ جس میں قرأت کی ضرورت ہو انکحت میں
صرف ایک عدد "ح" ہے۔ اسی میں سوال قرأت کا پیدا ہوتا ہے تو اس کی مشق کب مشکل
ہے ایک حرف کی بس چاہے نماز میں قرأت ہوتی ہو مگر نکاح کے لیے تو ایک ہی حرف کے
مشق کی ضرورت ہے۔ تو جناب آپ نے مشق بھی کر لی۔ لیکن ہولناک اُسے ہم نے بنا دیا
تاکہ ہماری ضرورت باقی رہے تو ہم نے کہا قصد انشا اور آپ عربی نہیں جانتے تو قصد انشاء کو
کیا کہیں گے آپ انکحت کہہ رہے ہیں اس کے معنی نہیں معلوم قبلت کہہ رہے ہیں۔ اس
کے معنی نہیں معلوم۔ تو جناب وہ قصد انشاء آپ کیونکر کریں گے۔ لہٰذا بغیر ہمارے نکاح ہی
نہیں ہوگا۔ آپ جائیے ہم کو چھوڑ کر کہاں جائیں گے۔ تو جناب یہ ہولناک بنانا جو ہے' میں
اس کا قائل نہیں ہوں اور میرے نزدیک کوئی سنجیدہ صاحب علم اس کا قائل نہیں ہے تو جناب
والا۔ ذرا غور فرمایئے کہ لفظوں کے معنی جاننے کی نہیں ضرورت بس قصد انشاء کی حقیقت کیا
ہے یہاں ہمارے والد ماجد اعلی اللہ مقامہ بھی اکابرین علما میں سے تھے تو وہ ارشاد فرماتے
تھے کہ اگر ہم صرف نحو سے واقف ہیں اور معنی لفظ کے جانتے ہیں تو ممکن ہے کہ ہم اس کے
لفظی معنی میں پڑ جائیں کہ یہ صیغہ کونسا ہے اور یہ ماضی ہے۔ مگر یہاں استعمال اس کا وہ جو
پیچیدگیاں ہیں۔ انحکت ماضی میں نے نکاح کیا۔ مگر اگر خبر کی نیت ہو۔ تو میں نے کیا تھا۔

تو کہاں کیا تھا۔ تو غلط ہے، وہ جھوٹ ہے۔ وہ تو اب کر رہے ہیں۔ وہ صیغہ ماضی ہے۔ مگر استعمال اُس کا ماضی میں نہیں کرنا ہے تو ہم اس فعل میں پڑ سکتے ہیں کہ یہ ماضی کا صیغہ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں۔ لیکن جو معنی سے واقف نہیں ہے وہ تو بس یہ جانتا ہے کہ یہ لفظیں مجھے سکھائی گئی ہیں اور ان لفظوں سے نکاح ہو گا۔ بس یہی قصد انشاء ہے، یہ تو جو جاہل ہے وہ تو بس اوپر سے نکاح کرے گا۔

اُس سے کہا کیا کہہ رہے ہیں آپ انکحت کہا مجھے کیا کہہ رہا ہوں بس جو کہہ رہا ہوں۔ وہ سچ ہے بغیر اس کے نکاح نہیں ہو گا تو اب یہ جو میں کہہ رہا ہوں یہ بس یہی کام کر رہا ہوں کہ عقد اس سے ہو جائے تو اصل حقیت سے غرض نہیں۔ تو یہ بات جاننا کہ کس لفظ سے ہو گا۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ قصد انشا ہو گیا اور وہ بہت ہی اعلیٰ درجے کا قصد انشا ہوا۔ تو یہ بہر حال انکحت اس نے کہا اور قبلت اس نے کہا۔ اسی وجہ سے حقیقت ہے کہ عام طور سے ہماری فقہ کے علاوہ جو افراد میں نے...... علی گڑھ تک جا کے موقع ملا مجھے پہلے تو اکثر کے ساتھ ہم جواب دیا کرتے تھے کہ اگر اس طریقے سے جو فقہ اہل بیت میں ہے اور حقیقت میں وہ فقہ محمدی ہے اور حقیقت میں وہ شریعت الٰہی ہے اس طریقے سے ایجاب وقبول نہیں ہوا اور اکثریت کے طریقے پر ہو گیا عقد تو پھر صحیح ہے یا نہیں ہے؟ تو اُس میں لکھنا پڑتا تھا کہ اگر ایجاب وقبول ہوا ہو تو پھر صحیح ہے مگر میں نے جو جا کے دیکھا اور شرکت کا مجھے وہاں زیادہ موقع ملا تو میں نے تو یہ دیکھا کہ وہ جا کے پوچھا جاتا ہے لڑکی سے کہ تمہارا عقد پڑھیں۔ وہ کہتی ہے کہ ہاں پڑھ دیجئے۔ اس کی گواہیاں لے لی جاتی ہیں کہ اُس نے کہا کہ پڑھ دیجئے اور اس کے بعد خطبہ۔ یعنی جو کھڑے ہو کر پڑھا جاتا ہے اور اُس کے بعد اُس سے پوچھ لیتے ہیں۔ شوہر سے کہ میں اس کا عقد تمہارے ساتھ کروں تمہیں منظور ہے۔ اس نے کہہ دیا منظور اور بس مبارک باد ہو گئی۔ یعنی اُس سے پوچھا تمہارا عقد پڑھیں۔ اس سے پوچھ لیا کہ تمہارے ساتھ اُس کا عقد پڑھیں۔ اس نے بھی کہا ہاں اُس نے بھی کہا ہاں، مگر وہ عقد پڑھا

گیا ہی نہیں۔ بس صرف دریافت کر لیا گیا۔ تو سب کچھ ہو گیا۔ مگر اصل ایجاب وقبول نہیں ہوا۔ تو وہ اس کو...... بہر حال وہ اس میں کوئی فرقہ وارانہ خصوصیت نہیں ہے کہ کس مسلک کا آدمی ہو پڑھنے والا۔ لیکن جو ضروری ہے وہ عمل میں آئے تو اگر وہ ایجاب وقبول نہیں ہوا۔ تو دونوں ہی...... فرض کیجئے کہ اس ہمارے یگانہ حلقے سے ہوتے اور اس طرح سے پڑھتے تو وہ بھی ناجائز ہوتا۔ اس میں یعنی خصوصیت فرقہ کا دخل نہیں ہے بلکہ اس میں قانون کی پابندی کا دخل ہے کہ ایجاب وقبول عمل میں آنا چاہیے' وہ کوئی بھی ہو' اس ایجاب وقبول کو عمل میں لانے والا۔ اگر نہیں ہوا تو ناجائز تو یہ دو طرفہ جب ضرورت ہے تو اُس کا نام ہے "عقود" اب دو شعبے ہو گئے۔ عبادات اس میں قصد قربت کی ضرورت ہے اور جن میں نہیں ضرورت' اس میں یہ دو طرفہ ایجاب وقبول کی ضرورت ہے ان کا نام عقود۔ ہماری زبان میں تو عقد فقط نکاح ہی کو کہتے ہیں۔ مگر یہ کہ حقیقت میں ہر معاہدہ جس میں طرفین سے ایجاب وقبول ہو وہ اصطلاحی طور پر عقد ہے یہ عقد نکاح قید کے ساتھ لگائی گئی ہے اور شریعت میں...... وہ بھی عقود میں داخل ہے اور اس میں بھی ایجاب وقبول ہوتا ہے اور اسی طرح سے اب جہاں دونوں طرف سے معتبر ہے۔ اس کو کہہ دیں گے۔ عقود اور جہاں دونوں طرف سے معتبر نہیں ہے۔ مگر ہے صیغے کی ضرورت تو اب جب دونوں طرف سے نہیں ہے تو ایک ہی طرف کے صیغے سے ہو جائے گا اس کا نام ہے "ایقاعات" اس میں طلاق داخل ہے طلاق بغیر صیغہ نہیں ہو گا۔ جو صیغہ معتبر فرض کر لیا گیا۔ اب اس میں وہ شرطیں ہیں کہ گواہیوں کی ضرورت ہے اور طرفین موجود ہوں۔ لیکن وہ صیغہ عقد جیسے نکاح میں ہوتا ہے ویسے ہی طلاق میں بھی ہوتا ہے۔ مگر یہاں طرفین سے ایجاب وقبول ہوتا ہے اور وہاں بس شوہر کی طرف سے صیغہ طلاق جاری ہوتا ہے تو صیغے کی ضرورت ہے مگر طرفین کے ایجاب وقبول کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک طرف کے صیغے سے وہ عمل میں آجائے گا۔ تو اس کا نام ہے ایقاعات اچھا اب وہ ایک نہیں' تو اُدھر ابھی موجود ہے۔

نہ قصد قربت کی ضرورت ہے اور نہ صیغوں کی ضرورت ہے نہ کسی ایک صیغے کی ضرورت۔ یعنی طرفین سے نہ ضرورت ہے اور نہ کسی ایک طرف سے صیغے کی ضرورت ہے تو اب ارکان شریعہ کا یہ باب کہ جس میں یہ قصد قربت کا دخل ہے، نہ کسی صیغے کا دخل ہے اب یہ کیا ہے یہ ہے احکام ان کا نام ہے تو وہ چار ہو گئے۔ عبادات۔ عقود۔ ایقاعات اور احکام

اب احکام بڑے، بہت سی اس کی مثالیں ہیں جناب ''میراث'' نہ وہ قربت الی اللہ سے جائید ادآئے گی...... نیت کے ساتھ...... نہ ایجاب وقبول کے صیغوں سے وہ آئے گی۔ بس ادھر باپ دنیا سے اُٹھا اور بیٹا یا اولاد جو بھی ہو۔ بشرطیکہ بیٹی کو میراث سے محروم نہ کیا جائے تو وہ اولاد وارث ہو گئی یہ بھی قانونِ شرع کی بناء پر ہوئی۔ یہ بھی حکم شرع سے ہوا تو اب یہ کون...... نہ قصد قربت اس میں دخیل ہوا اور نہ کوئی صیغہ طرفین کا، نہ ایک طرف کا......

بس ایک حکم شرع ہے جو ثابت ہو گیا تو یہ ہے شعبہ احکام کا مطاعم ومشارب یعنی کھانا پینا یہ جانور حلال...... یہ جانور حرام۔ اب وہ حلال ہوا ہے کسی صیغے سے اور یہ حرام ہوا۔ کسی صیغے سے؟...... ہاں وہ ذبح کیلئے ایک شرط بسم اللہ کہنے کی ہو گئی ہے۔ وہ بھی اصطلاحاً کوئی صیغہ نہیں ہے۔ پھر بھی ہاں کچھ الفاظ ہیں۔ لیکن یہ کہ اور چیز جو ذاتاً حرام ہیں فرض کیجئے کہ جو گوشت حرام ہے وہ کیا کوئی صیغوں کے ذریعے سے حرام ہوا ہے۔ بس اللہ کی طرف کا ایک حکم ہے کہ وہ حلال اور یہ حرام ہے وجائز ہے۔ یہ ناجائز ہے۔ شراب حرام ہے کوئی صیغہ پڑھ کے حرام ہوئی ہے...... حرام ہے یہ حکم شرع۔ تو اب پورا نظام حیات کا کون جزو ہے۔ جو ان شعبوں سے باہر ہو کہ وہ قانونِ شریعت کی حدود سے الگ ہو۔ تو فقہ اسلامی اور جو ترجمان ہیں اور حقیقت میں جو مجموعہ ہے حکم شرع الٰہی کا، اس کا دائرہ تو پورے شعبہ زندگی پر حاوی ہے یہ تمام ابواب اس میں داخل ہیں۔ اب وہ میں سیاست کی دنیا کا آدمی نہیں ہوں۔ مگر جو واقعات ہیں۔ وہ تو ہر سیاست دان بھی جانتا ہے اور غیر سیاست دان بھی جانتا ہے کہ جب بدیسی حکومت ہوئی یعنی غیر کی حکومت۔ حکومت سات سمندر پار سے آنے والی جب وہ

برسراقتدار ہوئی۔ تو جناب انہوں نے بڑے زور و شور سے اعلان کر دیا کہ سب کو مذہبی آزادی ہے۔ آج تک دنیا اُس مذہبی آزادی کو یاد (رکھتی ہے) کرتی ہے مگر مذہبی آزادی کا کیا مطلب کہ عبادات تمہیں مبارک ہوں اس میں ہم کوئی دخل نہیں دیں گے۔ جو جس طرح چاہے نماز پڑھے۔ جو چاہے جس طرح چاہے روزہ رکھے۔ جو جس طرح چاہے۔ چاہے اُس وقت کھولے چاہے اس وقت کھولے۔ چاہے پورا رکھے۔ چاہے ادھورا رکھے۔ چاہے نمازیوں پڑھے' چاہے یوں پڑھے۔ حج کرنا ہو تو تمہیں مبارک حج کر و جاکے۔ ہم کو اس شعبے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عبادات میں آزادی...... اور ایک جملہ یہ کہا کہ ہر فریق کو اس کے پرسنل لاء میں آزادی ہے پرسنل لاء میں ہمیں کوئی دخل دینا نہیں ہے مگر پرسنل لاء کیا ہے؟

یعنی نکاح جس طرح چاہتے ہو کرو اور میراث میں جو تمہارا اصول ہو۔ اس میراث کے مطابق تمہارا ورثہ تقسیم ہوگا۔ وہ بھی جبراً نہیں اگر تم شرع محمدی کی پیروی کرنا چاہتے ہو تو پھر اس طرح اور اگر تم کہتے ہو کہ جی ہم۔ فرض کیجئے کہ رواج کی پابندی کرنا چاہتے ہیں۔ بحمد للہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پنجاب میں عام طور سے بلاتفریق فرقہ لڑکیوں کو میراث نہیں دی جاتی۔ یعنی اس جز میں بہ اختیار خود' شریعت اسلام کو دنیا تسلیم نہیں کر رہی تھی اور لطف یہ ہے کہ جو چودہ سو برس سے احتجاج کر رہے ہیں لڑکی کو میراث نہ دینے پر' وہ بھی عامل اسی پہ تھے کہ لڑکیوں کو میراث نہیں ملتی تھی۔

تو یہ جو وہ کہیں، اقرار کریں کہ ہاں ہمیں شریعت کے مطابق تقسیم کرانا ہے تو بالکل آزادی ہے شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اس کے لحاظ سے میراث دلوائی جائے گی تو یہ میراث کے کچھ شعبے ہیں۔ وہ پرسنل لاء میں تمہارے لیے شریعت اسلام کے حدود میں داخل ہیں اور یہی نکاح وغیرہ طلاق یہ چیزیں جو ہیں یہ شریعت اسلام ہیں۔

مگر جناب ہماری شریعت اسلام کا دوسرا محکمہ قضاء...... وہ ہم سے لے لیا گیا۔ محکمہ قضاء کا تعلق اب فقہ اسلام سے نہیں رہا۔ ہمارے ہاں قانون شہادت تھا۔ وہ بھی فقہ کا جز ہے

وہ قانون شہادت اب ہمارا کتابوں کے اندر رہ گیا۔ وہ ہم سے لے لیا گیا۔ فوجداری کا پورا محکمہ وہ ہمارے ہاتھ سے لے لیا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنے فقہ کے ابواب تھے حدود و تعزیرات کے۔ اب تو تعزیرات ہند کے قرآن پر عمل کرنا ہوگا۔ اس قرآن پر عمل کرنا نہیں ہو گا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جس بات میں اپنے مفاد سیاست کو نقصان نہ پہنچے اتنا تو شریعت اسلام کی حدود میں تسلیم اور جہاں نظام حکومت سے ٹکراؤ ہو اور جہاں ہمارے اقتدار کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ وہ سب شعبے اب سلب کر لیے گئے۔ وہاں آپ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ اس کو شریعت اسلام کے مطابق ہونا چاہیے' کیونکہ وہاں تو آپ کو قانون کی پابندی کرنا چاہیے اور بہر حال جب اقلیت ہیں اور ہم ہیں وہ جن کا جرم ہے دنیا میں تقیہ...... مگر بحمد اللہ اس منزل پر آ کے تمام عالم اسلامی کا اجماع ہو گیا تقیے پہ...... یہ شعبہ چھین کے الگ کیا شریعت سے انہوں نے کہا بحمد اللہ...... بہت عمدہ...... صحیح ہے...... خاموش۔

اسی کا تو نام تقیہ ہے...... خوف سے خاموش رہنے کا۔ یہ ہمارے جرم میں کیوں آپ شمار کرتے ہیں۔ وہ تو وقت آنے پر ہر ایک ہی تقیہ کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ خوش نصیبی سے آپ کو موقع کم ملے ہوں۔ تقیہ کے اور اسی لیے آپ کو "تقیے" پر غصہ ہے کہ اسے ایک جماعت نے سپر بنا کے اپنی جان بچالی۔ یعنی ہمیں جان لینے کا موقع نہیں ملا۔ اس تقیے کی وجہ سے ورنہ وقت پڑنے پر تو وہ فطری چیز ہے سب ہی تقیہ کرتے ہیں۔ فطرت کے خلاف جو اصول قائم کیا جائے وہ نبھتا تھوڑی ہے۔ وقت آنے پر سبھی تقیہ کرتے ہیں اور مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ اسے لطیفہ سمجھئے اور حقیقت ہے اسی میں لطیفہ مضمر ہے کہ تقسیم ہند کے بعد سنہ 47 کے بعد میں نے اخبار میں۔ "سیاست" اخبار جو کانپور کا ہے اور علمبردار ہے اسی نظریات کا اور ہمارے بہت خلاف لکھا کرتا ہے۔ تو ایک صدر مدرس کانپور کے ان کا خطبہ میں نے دیکھا 47ء کے بعد کہ "بر بنائے تقیہ" اس سال "قربانی گاؤ" سے احتراز لازم ہے' بقر عید سے پہلے یہ فتویٰ شائع ہوا۔ عمل اسی پر ہوا...... بر بنائے تقیہ اس سال "قربانی" "گاؤ" سے

احتراز لازم ہے۔ عالمانہ زبان ہے انہی کی زبان میں میں نے عرض کیا۔ اُسے پیش کر دیا۔ تو اب لطیفہ یہاں پر یہ ہے کہ میں نے وہ فتوئی دیکھا۔ تو میں نے کہا کہ بے چاروں نے نیا نیا تقیہ کیا ہے انہیں یہ نہیں خبر کہ تقیہ کہہ کے نہیں ہوتا۔ چنانچہ جناب کبھی کسی منزل پر کہا کہ جس چیز کو منع کیا جائے وہ تو واجب ہو جاتی ہے مگر یہاں جناب اب عملاً قربانی گاؤ حرام ہوگئی، بلا تفریق فرقہ تمام مسلمانوں میں ایک نہ تھا جو یہ کہے کہ مہاراج یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

وہ بھی مسلمانوں کے مدرس تھے اڑیسہ کے اور بنگال کے بلا تفریق جماعت وہ بھی اس پر عامل ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اکثریت کے رحم و کرم پر ہم راضی ہے اور باقی پورے ملک میں حلال خدا حرام ہو گیا عملاً۔ مگر مسلسل جب سے بحمد اللہ مجھے تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارا تو اصول ہی یہ ہے مگر دنیا اب تسلیم کرلے اور اب اُسے آپ خوف جان کہہ لیجئے' اُسے بزدلی کہہ لیجئے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ وہ دین عام کا تحفظ بھی ہے تو حضور یہ میں اُس کو غلط نہیں سمجھتا' اُس اصول کو' صحیح ہے واجب نہیں تھا اب مجبوری سے آپ نے ترک کر دیا تو کیا ضرورت ہے اس عمل کرنے کی جب وہ باعث فساد ہے جبکہ باعث بدامنی ہے جبکہ خون ریزی کا ذریعہ ہے ایک جانور کی قربانی کی بناء پر ہزاروں آدمیوں کی قربانی ہو جائے یہ کوئی عقل کا تقاضا نہیں ہے لہٰذا عقل کا تقاضا نہیں ہے تو جو دین دین عقل ہے اس کا تقاضا بھی نہیں ہوگا۔ تو جناب میں اسے قابل اعتراض نہیں سمجھ رہا ہوں۔ یعنی یہ کہ گویا میں تفریق کر رہا ہوں کہ کبھی لوگوں کو گاؤ کشی کی پابندی نہیں کرنا چاہیے کہ وہاں میں اس کی تبلیغ نہیں کر سکتا تو یہاں اتنی دور آ کے اس کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ جو فرق محسوس ہو۔ وہاں بھی اس کی تبلیغ ہو سکتی ہے۔ یہاں بھی ہو سکتی ہے اور جو فرق کے خلاف ہے۔ جو صحیح زیادہ ہے وہی وہاں بھی کہا جائے گا۔ وہی یہاں بھی کہا جا سکتا ہے تو جناب والا یہ بہر حال...... اب جب نظام ملکی بدلا۔ اب یہ سب شعبے ابھی بدلنے سے پہلے۔ اُسی وقت حذف' نکال لیے گئے شریعت اسلام کی عملداری سے اور یوں کہنا چاہیے وہ ناقص نامکمل گویا شریعت کا آپکو پابند رہنے دیا

گیا۔صرف عبادات کے شعبہ میں تم شریعت اسلام کو مانو صرف ہماری اصلاح کے مطابق عقود کے ایک جزو وہ اسے مانتے رہو اور ایقاعات کا ایک جز طلاق اس کو مانتے ہو۔ اور احکام کا جز یعنی میراث اس کو مانتے رہو باقی تعزیرات وہ سب اس کے قانون الگ اور حدود کا سوال ہو باقی نہیں رہا اور قضاء و شہادات وہ سب ابواب فقہ معطل اور اسکے بعد جناب شریعت اسلام میں تو کبھی کچھ ہے مضارعات ہے اور زمیندار اور کسان کے باہمی تعلقات بھی سب شریعت اسلام کی حدود میں ہیں مگر وہ سب ہمارا قانون چلے گا چاہے جس فرقے کے ہو تم کو شریعت اسلام کا نام لینے کا وہاں حق نہیں ہوگا ہم قائم کریں گے ہم زمینداریاں مقرر کریں گے ہم اس میں جو چاہیں گے وہ اصول مقرر کریں گے فرزند اکبر مثلاً وارث ہے تمہیں وہاں حق میراث کا اس دائرے میں اصول کوئی لانے کا حق نہیں ہوگا۔ تو یہ جناب گویا اطراف و جوانب سے کتر کے اور کہیے تو کتر کے کہوں اور کہیے تو حذف کر کے کہوں وہ ہر ایک کے لحاظ سے صحیح ہوگا تو وہ جناب اس سب کو زرا ناقص غیر مکمل طور پر دے کر اور بہانگ دہل اعلان کیا گیا کہ...... مذہبی آزادی ہے۔ اب جناب جب تقسیم ہند ہوئی تو اب وہ پھر سیاست کی دنیا میں تو میں دخل نہیں رکھتا مگر اب وہ جو سیاست دان ہو وہ بھی جانتا ہے کہ تقسیم ہوگئی۔ جو غیر سیاست دان ہو وہ بھی جانتا ہے کہ تقسیم ہوگئی تو اب وہی جو اسوقت کا نظام تھا انہی حدود و قیود کے ساتھ وہ پورا وراثت میں ملک کے دونوں بھائیوں کو ملا...... اب جو مورث اعلیٰ حدود قائم کر گئے تھے وہی مورث اعلیٰ کی حدود کی ہوئی میراث بھی دونوں طرف آئی تعزیرات کا قانون وہی آیا محکمہ گواہ شہادات کا قانون بھی وہی آگیا۔

اور جناب وہی مضارع مقامات زمینداریاں۔ وہ سب قانون آئے اس میں ترمیمیں بھی ہوئیں۔ وہ تو میں کہہ چکا جسکے ہاتھ میں قانون ہوتا ہے وہی ترمیمیں کرتا ہے جب چاہا زمینداریاں دیں جب چاہا قانون زمینداریوں کے سلب کرنے کا بنا لیا۔ نہ وہ آپ سے پوچھ کے کیا تھا نہ یہ آپ سے پوچھ کے کیا۔ اب شریعت اسلام سے اس شعبے کا

کوئی مطلب ہی گویا نہ تھا۔ لہٰذا وہ اب ایک ملکی قانون الگ اور ایک مذہبی قانون الگ۔ وہ جتنے دائرے میں اس وقت تسلیم تھا۔ اسی دائرے میں بعد میں بھی تسلیم رہا۔ وہی عبادات...... اور پرسنل لاء ہر ایک کا۔ اُسی کے مطابق فیصلے...... جج وہی ہوں گے مگر فیصلے تمہارے قانون کے مطابق کریں گے۔ جو تمہارے قانون کے ماہر ہیں۔ اُن سے ہم فیصلہ نہیں کرائیں گے بلکہ قانون تمہارا ہے اور ماہر ہماری طرف کے ہوں گے۔

اُس قانون کے مطابق ہم دیکھیں گے کہ کیا تقاضا ہے اس کا کسی عالم فاضل سے نہیں پوچھیں گے کہ وہ ہمارے لحاظ سے تھوڑی عالم ہیں۔ وہ تو تمہارے یہاں کے ہیں۔ لیکن یہ کہ قانون تمہارا ہوگا۔ علم اس کا ہم رکھتے ہیں۔ ہم فیصلے کریں گے۔ تمہاری شرائع کے مطابق تمہارے رہنما اپنی جگہ جو چاہے لکھتے رہیں۔

ہمارے ہاں تو ڈاکٹر امیر علی نے جو محمڈن لاء کے ماہر سمجھے جاتے ہیں لکھ دیا کہ جو اس تصور کا حامل ہوگا کہ یہ بشر کا بنایا ہوا قانون ہے اور اسے مسلمان بھی تسلیم کر رہے ہیں کہ یہ ان کا قانون ہے۔ یعنی اللہ سے رشتہ اسی وقت قطع کر دیا کہ جس وقت میں اس کو ان کا قانون کہا۔ تو اب اس کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ جو چیز میراث میں ادھر سے آئیں اور اُدھر سے آئیں۔ اس سے مجھے مطلب نہیں لیکن اُدھر کی بات مجھے چشم دید ہے۔ وہ کہہ رہا ہوں کہ اب وہاں جتنے دائرے میں کہ شریعت کی عملداری تسلیم بھی کی گئی اب تک مورث اعلیٰ کے دور میں اور اب ان کی وراثت کے ملنے کے بعد یعنی پرسنل لاء جس کا نام رکھا گیا۔ اب اُس میں انفرادی آوازیں آتی رہتی ہیں کہ پرسنل لاء ملک کا ایک ہونا چاہیے۔ یعنی اس میں یہ کہ اکثریت واقلیت کی تفریق نہیں ہونا چاہیے۔ ایک ہونا چاہیے سب کے لیے۔ اب چونکہ بااقتدار جماعت ظاہر بظاہر اگر اپنوں کی ہوتی تو مسلمانوں کی آنکھ نہ کھلتی۔ چونکہ اب اس سے ظاہر ہے کہ اپنی جگہ اکثریت ہے تو قانون حکومت میں اپنی جگہ اکثریت۔ لہٰذا چونکہ اب اُدھر سے آواز آئی ہے۔ لہٰذا تو اب مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں۔ اب جناب مسلمان بیدار ہوئے

اور انہوں نے بڑی بڑی کانفرنسیں۔ بمبئی میں جو کانفرنس ہوئی۔ کئی لاکھ کا وہاں اجتماع تھا بحمد اللہ میں بھی اس میں شریک تھا۔ تو جناب والا...... اب گویا اجماع ملت اسلامیہ سے صدا بلند ہوئی کہ شریعت اسلام نا قابل تبدیل ہے۔ جیسے کہ میرا موضوع ہے اب تمام مسلمانوں کی آواز یہی ہے کہ ''شریعت اسلام نا قابل تبدیل ہے'' ''شریعت اسلام نا قابل تبدیل ہے۔''

اس کا مستقل ادارہ بھی بن گیا۔ جو نظر رکھے کہ کون قانون پاس ہو رہا ہے۔ ابھی چاہے پاس ہوا نہ ہو کہ جو شریعت اسلام کے کسی...... مثلاً ایک وہ متبنیٰ کا قانون وہاں زیر نظر ہے۔ اب اس کی طرف آواز بلند کی گئی کہ یہ متبنیٰ کا قانون ہے یعنی گود لینے کا۔ یہ شریعت اسلام کے خلاف ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمہارے اصلی بیٹے وہی ہیں جو پیدا ہوئے ہیں۔ تمہارے صلب سے اور دوسرے کا کہنے سے کوئی بیٹا نہیں ہو جاتا۔ اب یہ سب آیتیں...... وہ سب میں نے اس مشترک مجمع میں کہا کہ کم سے کم اس دور میں تو یہ بات متفق علیہ ہوگئی۔ کم سے کم اس دور میں بحمد اللہ یہ بات متفق علیہ ہوگئی کہ قانون اسلام کی شریعت میں...... شریعت اسلام میں نئی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور یوں بھی اصل میں ان تحریکوں پر احتجاج کا حق ہم ہی کو ہے کہ ہم نے اصول میں کسی تبدیلی کو تسلیم نہیں کیا۔ مگر صبح کا بھولا شام کو آئے تو اس کو الزام نہیں دینا چاہئے' ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیے اسی طرح کم سے کم چودہ برس کے صبح و شام کے فرق سے۔ اب یہ تمام امت اسلامیہ کا اجماع ہو گیا کہ شریعت اسلام میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

ورنہ اب یہ تو تلخ حقیقت ہے کہ میں نے عرض کیا کہ جب سے یہ تبدیلیاں اقتدار وقت کی طرف سے شروع ہوئیں۔ اسی وقت سے عبادات کا شعبہ تو آزاد چھوڑ دیا گیا اور آج بھی جتنی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اس میں عبادات سے کوئی بحث نہیں ہے۔ پرسنل لاء وہی معاملات کا جو شعبہ ہے عقود کا۔ ایقاعات کا۔ اسی میں کہا جا رہا ہے کہ ایک قانون ہو یا جو میراث کا...... اس کے علاوہ عبادات میں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی کسی ذہن

ے یہ آواز نہیں نکلتی کہ عبادات میں کسی کو کوئی بھی تبدیلی کسی بھی نقطہ نظر میں کی جائے۔ مگر
اب یہ تلخ حقیقت ہے کہ بعد پیغمبرؐ عبادات تک نہیں محفوظ رہے اور اب ان کی تفصیلات میں
نہیں جاؤں گا کیونکہ کوئی فرقے وارانہ تلخی پیدا کرنا میرے مسلک کے خلاف ہے لیکن اب
یہاں پر ے کہ بالکل متفق علیہ ہے کہ حالات صحابہ کی کتابوں میں دیکھیے کہ ایک صحابی دمشق
ے آئے مدینے اور مدت کے بعد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے پیچھے نماز یہ
اسباب...... جتنی حالات صحابہ کی کتابیں ہیں ان سب میں ہے کہ جو وہاں سے آئے اور
انہوں نے مدت کے بعد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں
نے کہا...... ارے اس وقت انہوں نے مجھے وہ نماز یاد دلا دی۔ جو میں رسول اللہ کے پیچھے
پڑھتا تھا۔ یعنی مدت اتنی درمیان میں گزر چکی تھی۔ جیسے کہ بھول ہی گئے تھے کہ وہ نماز کیا تھی
اور اب اتنے دنوں کے بعد اس نماز کی تجدید ہوئی تو اب یاد آیا تو اگر تحریفات نہ ہوئی ہوتیں تو
یہ صحابی یوں کیوں کہتے کہ وہی نماز یاد دلا دی۔ جو پیغمبر خدا کے زمانے میں ہوتی تھی اور اس
کے بعد...... یہ تو تفاسیر میں بھی ہے۔ جس کا دل چاہے علامہ رازی کی تفسیر کبیر میں دیکھ لے۔
نیشاپوری کی غایت القرآن کی تفسیر نیشاپور میں دیکھ لے اور تاریخ میں دیکھ لے کہ امیر شام
جو آئے مدینہ منورہ میں اور مسجد نبوی میں نماز پڑھائی۔ کیونکہ اب تو جو برسر اقتدار ہو۔ اس کا
حق ہو گیا پیش نمازی کا۔ مدت ہوئی۔ آج بھی عام ذہنیت یہ ہے کہ اگر کسی برسر اقتدار آدمی
کے پیچھے نماز پڑھ لی۔ تو معلوم ہوا کہ عمر بھر میں آج یہ سعادت نصیب ہوئی۔ تو بڑی عمدہ نماز
وہ ہو جاتی ہے جو کسی صاحب اقتدار کے پیچھے ہو...... تو جناب وہ انہوں نے نماز پڑھائی اور
اب ظاہر ہے کہ اس وقت مدینے کی آبادی میں زیادہ تر صحابہ رسولؐ ہیں اور تابعین ہیں۔ تو
مسجد نبوی میں جو نماز پڑھائی اس میں انہوں نے بسم اللہ نہیں کہی۔ یعنی سورہ بغیر بسم اللہ
پڑھے اور رکوع و سجود میں جاتے وقت جو اللہ اکبر ہوتا ہے یہ نہیں کہا تو جناب جونہی نماز ختم
ہوئی تو مسجد نبوی کے ماموین میں جو صحابہ تھے اور تابعین تھے۔ شور ہو گیا کہ...... کہ ارے

قرآن کی ایک آیت تم نے چرالی اور یہاں علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں کہ اتنا صاحب جاہ و جلال اور اتنا صاحب شان وشوکت مسند اقتدار پر متمکن انسان اور اس کے پیچھے یہ تمام آوازیں بلند ہوگئیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایسے مسلمات دینی میں تھا اور اب تک کا متفق علیہ عملدرآمد تھا۔ بسم اللہ کا آواز کے ساتھ کہنا کہ شور ہو گیا ورنہ یہ جرأت کیوں ہوتی۔ مگر یہ ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ اگر اس وقت عملدرآمد ملت اسلامیہ کا اسی جز پر ہو گیا ہو۔ کہ بسم اللہ نہ کہی جائے اور تکبیریں نہ کہی جائیں...... اس کے معنی یہ ہیں کہ جو اس وقت بدعت تھی وہ سنت بن گئی۔ جو چیز اُس وقت مسلمات اسلام کے خلاف تھی۔ وہ اب اس وقت تو مسلمات اسلامی بن گئی۔

اب یوں تو مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ آج چھٹی کا دن ہے اور بارہا مجھے متنبہ کر دیا گیا ہے۔ منبر پر آتے وقت یاد دلا دیا گیا ہے تو میں خاموشی سے سنتا رہا۔ یاد تو مجھے تھا ہی کہ دن کون ہے تو وہ سنتا رہا مگر معذرت ضرور کرنا ہے کہ اب چاہے آپ کو فرصت جتنی ہو مگر میری عمر کا تقاضا بھی کوئی چیز ہے تو اس میں غیر چھٹی اور چھٹی کے دن میں کوئی خاص فرق میرے لیے نہیں پیدا ہوتا ہے تو اس بناء کے اوپر آپ کے ذوق سماعت کی اگر تسلی نہ ہو تو اس کے لیے معذرت کا طلبگار رہوں۔ تو یہ بھی نہ سمجھے گا کہ ابھی تقریر ختم کر رہا ہوں۔

غرض یہ کہ ہمیں معلوم کہ کون سی چیز کب سے شروع ہوئی۔ تاریخ بتلاتی ہے۔ کتب رجال بتلاتے ہیں حدیث بتلاتی ہے۔ اب اگر ہم کو یہ معلوم ہو کہ جو جو چیز کب تبدیل ہوئی تھی اس وقت کا ہم عملی مشاہدہ کریں تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ تو اب فیصلہ بالکل آسان ہے کہ جمہور امت کا عمل اس پر نہیں ہے جو ماضی میں تھا اُس پر عمل ہے کہ جو اس وقت حال تھا اور اب ماضی بنا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پوری امت نے اُس تبدیلی کو تسلیم کر لیا۔ اگر تبدیلی کو قبول نہ کیا ہوتا تو کیوں؟ اب وہ تبدیلی کیوں ہمارے مشاہدے میں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تبدیلیاں برابر قبول ہوتی رہیں اور بس اب اس مجمع میں مجھے اور

کچھ معلوم نہ ہوا خیال ہوتا ہے کہ وہاں موجود ہوں گے مگر اب وہ نظر تو نہیں آ رہے ہیں وہ کہیں پر ناظم علی شاہ صاحب ہوں گے۔ ان کے ہاں رات ایک مجلس بھی ہونے والی ہے۔ تو وہ جناب ناظم علی شاہ صاحب اب وہ کتنی ہی عمر کے اُس وقت ہوں مگر وہ اس وقت ہوں گے تقسیم ہند کے بعد لاہور میں جو حسینؑ ڈے ہوا تھا اور اس حسینؑ ڈے کی خصوصیت یہ تھی کہ دونوں حکومتوں نے دلچسپی لی تھی۔ یعنی ہمارے...... اب میں اس وقت یہاں ہوں تو ان کو ہمارے کہہ رہا ہوں مگر اس وقت آپ کے جو ہائی کمشنر سب سے پہلے ہوتے تھے۔ ہندوستان میں۔ راجہ غضنفر علی خاں صاحب مرحوم تو انہوں نے دونوں ملکوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لیے اور دونوں ملکوں کو آپس میں قریب لانے کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا تھا کہ حسینؑ ڈے مشترک ہو دونوں ملکوں کا۔ اس میں دونوں ملکوں نے دلچسپی لی تھی لاہور میں بیرونِ موچی دروازہ جو میدان ہے اب اس میں شاید دکانیں وغیرہ بن گئی ہوں۔ اس وقت میں وہ میدان بھی اور زیادہ کشادہ ہوگا وہ بیرون موچی دروازہ پنڈال بنا کر اور وہ حسین ڈے ہوا تھا۔ جس میں ہندوستان سے میں اور میرے بھائی صاحب مولوی کلبن صاحب قبلہ مرحوم اور اس کے علاوہ وہاں بنارس کے بابا خلیل داس اور ہمارے لکھنؤ کے فرنگی محل کے مولانا صبغت اللہ صاحب انصاری اور ہمارے مولانا محمد ہاشم انصاری اور اس وقت تک وہ بھی ہندوستان ہی کے تھے یعنی جوش ملیح آبادی صاحب ''شاعر انقلاب'' وہ اور گوپی ناتھن...... تیش اخبار کے ایڈیٹر اور بیاس دیو بسرا جو اس وقت بیرسٹری پر تھے اور اب وہ جسٹس ہیں۔ جسٹس کا س دیو مرا اب میں کہوں گا یہ اور وہاں حیدر آباد کے پروفیسر اور فلسفی ایک مشہور تھے وحید الدین صاحب وہ۔ یہ سب لوگ ہندوستان سے اور کچھ نام مجھے یاد نہیں رہے ہوں گے۔ یہ سب ہندوستان سے اس میں آئے تھے شرکت کے لیے جس میں بلا تکلف گویا گورنمنٹ کی طرف سے اجازت مل گئی تھی اور اس میں کوئی زحمت نہیں ہوئی تھی اور انتظام بھی باقاعدہ ہم لوگوں کا گویا گورنمنٹ کی ہی طرف سے آنے کا تھا آپ کے

یہاں۔ کراچی سے جو تشریف لے گئے تھے وہ مولانا ابن حسن صاحب جارجوی تشریف لے گئے تھے شرکت کے لیے اور اس کے علاوہ وہ بھی پاکستان ہی سے گویا آئے تھے۔ مگر ڈھاکے میں تھے جمال میاں فرنگی محلی' وہ اب کراچی میں ہیں۔ تو وہ مولانا جمال الدین ابن عبدالوہاب صاحب یہ مولانا عبدالباری صاحب کے جو آزادی ہند کی تحریک میں پیش پیش تھے وہ ان کے چشم و چراغ ہیں ان کے صاحب زادے ہیں۔ وہ سب ڈھاکے سے آئے تھے اور راجہ صاحب محمود آباد مرحوم وہ بھی پاکستان ہی ہوتے تھے یہاں سے وہ بھی تشریف لے گئے تھے اور اس کے بعد اجتماع اتنا تھا کہ بہت سی جگہ تقریریں میں نے کی ہوں گی مگر اتنا بڑا مجمع میں نے آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا اور اب اس مجمع کو میں نہیں کہہ رہا ہوں جو پردہ غیب میں ہوا کرتا ہے اس مجلس میں یعنی جو میری آنکھوں کے سامنے مجمع تھا اور خصوصاً جتنا یہ سامنے کی پوری پٹی میں جتنے لوگ ہیں۔ اتنا بڑا تو وہاں کا ڈائس تھا اس پر گویا خاص مہمانان...... وہ بیٹھتے تھے تو وہ اس کی وسعت اتنی ہوگی۔ جتنی ایک ہماری متوسط درجے کے بڑی مجلس کی ہوتی ہے اور اس پر تمام فرقہ اسلامیہ کے علماء اور بڑے بڑے اکابر اور فقہ نشین اور اہل حدیث کے علماء اور تمام ہر نقطہ نظر کے اکابر اس ڈائس پر تشریف فرما تھے وہاں جو میری تقریر ہوئی تھی تو وہ کتابی صورت میں وہاں کی تقریریں مرتب ہوئیں تھیں۔ مگر وہ الگ سے پھر کتابی شکل میں نہیں شائع ہوئیں۔ بلکہ رضا کار کے محرم نمبر کے طور پر بطور ضمیمہ وہ مجموعہ شائع ہو گیا۔ تو اس کے بعد کبھی کبھی میں مجلسوں میں دھرا دیا کرتا ہوں۔ تو جناب اب میں نے عرض کیا کہ ہر نقطہ نظر کے علماء وہاں تشریف فرما تھے اور موضوع میرا تھا کہ "واقعہ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا" اگر واقعہ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔

تو تمہید میں میں نے عرض کیا تھا یہ کہ آدمی دن کو آنکھ کھولے مثلاً کال کوٹھڑی میں قیام ہو اس کا اور دن کو وہ نکلا وہاں سے اور ابھی رات ہوئی نہیں تو اسے کیونکر بتایا جائے کہ آفتاب نہ ہو تو کیا ہو وہ تو جب رات آتی ہے تب سمجھ میں آتا ہے کہ آفتاب نہ ہو تو کیا ہوتا ہے تو اب

ہم نے تو اس وقت آنکھ کھولی ہے دنیا میں جب کہ آفتاب قربانی کربلا طلوع کر چکا ہے تو اب ہم اس وقت کیونکر بتلائیں کہ واقعہ کربلا نہ ہوتا۔ تو کیا ہوتا۔ مگر میں نے عرض کیا کہ بس اس کے سمجھنے کا میرے پاس ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ ہے کہ میں دعوت مطالعہ دوں گا۔ جو واقف کار ہیں وہ تو ہیں ہی جو ناواقف ہیں ان کو دعوتِ مطالعہ دوں گا کہ وہ یہ دیکھیں کہ جب تک نہ ہوا تھا تو کیا ہو رہا تھا۔ اُس سے سمجھ میں آجائے گا کہ اگر نہ ہوتا تو کیا ہوتا اور حسین ڈے میں اور جو جو میں نے عرض کیا وہ اس وقت تو نہیں عرض کر سکتا ہوں۔ مگر یہ کہ ایک چیز جب تک نہ ہوا تھا، کیا ہو رہا تھا...... کہ میں نے عرض کیا کہ مسعودی جیسا مورخ جس کے بارے میں علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ اتنا بڑا مورخ عالم اسلام میں نہیں پیدا ہوا۔ اس کی تاریخ ''مروج الذہب'' اندرون ملک بھی شائع ہوئی ہے اور بیرون ملک بھی شائع ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں تو غیر ملکی انگریزوں نے مستشرقین نے بھی شائع کی ہے تو جناب اس مرج الذہب میں جس کا دل چاہے دیکھ لے کہ صفین میں جاتے وقت بدھ کے دن جمعے کی نماز پڑھا دی گئی اور بحمد اللہ جتنے اس وقت کے مسلمان وہاں تھے اُن سب نے بلا تکلف پڑھ لی۔ اب اس کئی لاکھ کے مجمعے سے میں نے پوچھا کہ اب آجکل بدھ کا کیا ذکر، کوئی جمعے ہی کے دن زوال سے پہلے نماز پڑھائے چاہے کتنا ہی صاحب اقتدار ہو۔ تو آپ پڑھ لیجئے گا؟

پورا مجمع چیخ اُٹھا ہرگز نہیں پڑھیں گے۔ میں نے کہا پھر دیکھئے کہ درمیان میں کون سی چیز ایسی ہوئی جس نے یہ بیداری پیدا کی اور اس کے بعد دنیا والے بہر حال یہ سوال کرتے ہیں کہ اچھا واقعہ کربلا بے شک اتنا عظیم الشان اور اتنی قربانیاں پیش کیں۔ مگر اس کا حاصل کیا ہوا کیا یزید ایسے شراب خور پھر برسر اقتدار نہیں آئے کیا ویسے ہی بداعمال پھر مسند خلافت میں نہیں آئے۔ تو میں نے مختصر طور پر اس وقت عرض کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ کسی صاحب (اقتدار) کسی کا شراب خور ہونا اُس کا انفرادی عمل ہے اور جتنے جرائم ہیں اس کا مرتکب ہونا انفرادی عمل ہے اور اولیائے الہی یا انبیاء اُن کی جان اتنی مفت کی نہیں ہے کہ ایک ایک کے

گناہوں کے بچانے کے لیے اپنی جانیں دیا کریں۔ اب یہ وہ چیز ہے جو میرے اس موضوع سے متعلق ہے اور جس کے لیے میں نے تمام عالم اسلام کے علماء کو گواہ کیا اُس وقت اور مجمع سے کہا کہ جس کا دل چاہے بعد میں ان سے پوچھ لے کہ واقعہ کربلا سے پہلے ہر صاحب اقتدار کا عمل جزو شریعت بنتا رہا۔ تاریخ خلفاء کو کوئی دیکھ لے ہمیں معلوم ہے کس وقت سے کیا چیز شروع ہوئی۔ کس وقت سے کیا چیز شروع ہوئی۔ ہر صاحب اقتدار کا عمل جزو شریعت بنتا رہا۔ لیکن یزید اور اس کے بعد کسی صاحب اقتدار کا عمل جزو شریعت نہیں بنا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن شہنشاہوں کے جرائم اب انفرادی بن گئے۔ یہ خطرہ ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا کہ شریعت پر حکومت کا اثر قائم ہو اور شریعت کے احکام میں تبدیلی ہو جائے۔ تو یہ کلیہ...... میں دعوت مطالعہ دیتا ہوں کہ ہر ایک دیکھ لے کہ یزید سے پہلے ہر صاحب اقتدار کا عمل جزو شریعت بنتا رہا مگر یزید اور اس کے بعد کسی صاحب اقتدار کا عمل جزو شریعت نہیں بنا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حسینؑ نے اپنے خونِ ناحق سے وہ لکیر کھینچ دی ہے کہ حکومت الگ ہو گئی اور شریعت الگ ہو گئی اب کتنا ہی وہ صاحب حکومت ہو۔ مگر یہ خطرہ دور ہو گیا کہ وہ شریعت اسلام پر اثر انداز ہو سکے۔ بس میں کہتا ہوں۔ یہی تو اتنا بڑا مقصد تھا...... ارے کوئی فلسفہ شہادت سمجھے...... یہ تو بڑے ذہن کی بات ہے اور بہت گہرائی کی بات ہے کہ وہ غور کرے کہ حسینؑ کا مقصد کیا تھا۔ دو طریقے ہیں ایک کردار کی منزل میں ایک یہ کہ اثر کو دیکھو موثر کو سمجھو اور ایک کہ موثر کو جانو اور اثر کو سمجھو۔ دھواں دیکھا سمجھے کہ آگ لگی ہے۔ معلوم ہوا کہ آگ لگی ہے تو سمجھے کہ دھواں بھی اُٹھا ہوگا۔

تو دونوں طریقے ہیں۔ ادھر سے اُس کو ثابت کرو۔ اُدھر سے اس کو ثابت کرو۔ تو میں کہتا ہوں کہ خواہ آپ غور و فکر سے یہ سوچئے اور سمجھئے اور اس کے لیے بڑا ہی گویا ذہن کو صاف کرنے کی ضرورت ہے کہ مقصد امام حسین علیہ السلام کیا تھا اور کتنا اہم تھا اور دوسری صورت یہ ہے کہ اُن قربانیوں کو دیکھئے جو کربلا میں ہوئیں اور اُن سے سمجھئے کہ وہ مقصد کتنا

عظیم تھا جس کے لیے ایسی قربانیاں پیش کردی جائیں اور اب مجلسی زبان میں عرض کروں کہ علیؑ اکبر کی جوانی ایسی نہ تھی۔ جو کسی معمولی مقصد کے لیے اسے قربان کردیا جائے اور قاسم ایسا بھتیجا۔ اس کی محبت ایسی نہ تھی کہ اُسے قربان کردیا جائے کسی معمولی مقصد کی خاطر اور کہنے دیجئے مجھے آخر میں کہ زینبؑ کی چادر ایسی نہ تھی کہ کسی معمولی مقصد کی خاطر اس کو دے دیا جائے اور کربلا میں اگر جنگ مغلوبہ ہوتی اور سب ایک دم سے شہید ہو جاتے تو بحیثیت مصیبت قیامت تک ہمارے رونے کے لئے تو وہ بھی کافی تھا۔ مگر ماشاءاللہ صاحبان فہم ہیں۔ کربلا کے میدان میں جو تدریجی رفتار مصائب ہیں۔ یہ مولا کے جوہر اختیار قربانی کو نمایاں کرتی ہے اگر پہلے ہی علیؑ اکبر شہید ہو جاتے تو دُنیا کہہ سکتی تھی کہ ایسا بیٹا تو رہا نہیں۔ اب بیعت کر کے کیا کرتے۔ مگر کربلا میں اصحاب سب شہید ہو گئے عزیز ابھی سب موجود ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی اقرار بیعت کر کے حسینؑ عباسؑ جیسے بھائی کو بچا سکتے ہیں۔ اب بھی قاسم ایسے بھتیجے کو بچا سکتے ہیں۔ اب بھی علی اکبر ایسے بیٹے کو بچا سکتے ہیں کہ آپ کے لیے چند جملے مصائب کے کافی ہیں میں کہتا ہوں حسینؑ نے اپنے عمل سے ثابت کردیا کہ جس راہ میں حبیب کی پیروی کی گئی اُسی راہ میں علیؑ اکبر کی جوانی بھی جائے گی میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ کربلا کے رفتار مصائب سے جیسے صبح سے لیکر عصر تک مولا کے سامنے ایک میزان نصب تھا۔ ایک ترازو نصب تھا اس کے دو پلڑے ہیں۔ ایک پلڑے میں مقصد اور دوسرے پلڑے میں جو ہے وہ بدلتا رہتا ہے:۔

کبھی اصحاب کی وفاداریاں ہیں اور مولا اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ نہیں یہ قربانیاں مجھے گوارہ ہیں مگر مقصد پر اثر نہ پڑے اور اب ایک منزل وہ آتی ہے کہ ایک پلڑے میں وہی مقصد...... اور وہ اسلام اور شریعت اسلام کا وقار اور دوسری طرف عون ومحمد ایسے بھانجے اور میں کہتا ہوں کہ بھانجے کہنے سے وہ حقیقت ہے زینب کے فرزند...... اور مولا اپنے عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ نہیں یہ قربانیاں مجھے گوارہ ہیں مگر مقصد کو نقصان نہ پہنچے اور

اب وہ ایک منزل آئی کہ ایک پلڑے میں وہی سے اسلام اور شریعت اسلام اور دوسرے پلڑے میں قاسم ایسے بھتیجے کہ جو نو عمر ...... نوجوانی کا ...... بلکہ ابھی تو حد بلوغت تک نہیں پہنچے تھے۔ کمسنی تھی اور ایسا بھتیجا وہ میں بتاؤں کہ ارشاد شیخ مفید میں ہے کہ جب قاسم نکلے ...... دشمن کی فوج کا ایک سپاہی کہتا ہے۔

ایک ایسا بچہ آیا جیسے چاند کا ٹکڑا نکلا ...... اب دنیا بتائے کہ دشمن کی نگاہ میں جو چاند ہے وہ چاہنے والی ماں کی نگاہ میں کیا ہوگا ...... محبت کرنے والے چچا کی نگاہ میں کیا ہے ...... مگر یہ قربانی بھی گوارہ ہے ...... اب ایک پلڑے میں وہی اسلام اور وقار اسلام اور دوسرے پلڑے میں ابوالفضل عباس ایسے بھائی کی وفادار جوانی اور مولا کو تھام لیں گے کہتے جائیں گے۔

مگر مولا یہ ثابت کر دیں گے کہ یہ قربانی بھی مجھے گوارہ ہے اور اب ایک پلڑے میں اسلام اور شریعت اسلام ہے اور دوسرے پلڑے میں کہوں ایک لفظ جو پوری حقیقت کی ترجمانی ہے کہ دوسرے پلڑے میں شباب محمدی ہے اور مولا اپنے عمل سے کہیں گے کہ شریعت کے لیے بیٹا بھی جائے اور بیٹے کی قربانی بھی مجھے گوارہ ہے اور اب اہل عزا مصائب توکل سے بیان ہوں گے کہ وہ پانچویں تاریخ محرم سے حال شروع ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے ایک منزل تو وہ آئی کہ جہاں مولا نے ہاتھ پر قربانی کے وزن کو اٹھایا۔

میں کہتا ہوں کیسا ہوگا ...... کوئی کہے کہ چھ مہینے کے بچے کا وزن کتنا ہوگا ...... ارے چھ مہینے کا پھول اس کا کوئی وزن ہوگا ...... ایک جملہ اور بس اُس پر ختم ...... میں کہتا ہوں کہ میرے مولا حیدر کرار فیصلہ کریں گے کہ خیبر کا وزن زیادہ تھا یا اس چھ مہینے کے پھول کا۔

......☆......

# مجلس پنجم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا
(جاثیہ:۱۸)

ترجمہ: ہم نے تم کو دین کے کھلے رستہ پر قائم کر دیا ہے تو اسی رستہ پر چلو جاؤ۔

شریعت اسلام کی کچھ خاص خاص چیزوں کو لے کر اس مطالبے کی گویا سند میں پیش کیا جاتا ہے کہ اب موجودہ دور میں اس قانون میں تبدیلی ہونا چاہیے۔ اس میں ایک بہت بڑی چیز پوتے کی میراث ہے یعنی شریعت اسلام کا جو اصول...... کہ اگر بیٹے میت کے موجود ہیں تو پوتا محجوب ہے۔ اس کو میراث نہیں ملنا چاہیے اس کو گویا بڑے دردمندانہ انداز میں، جذبات انسانی کو بیدار کرتے ہوئے...... اب جتنا انسان میں خطیبانہ انداز زیادہ ہو...... اتنے ہی زیادہ موثر کرنے والے طریقے پر عوام کی ہمدردی کے جذبات کو بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اسی تناسب سے گویا اسلام کے اس قانون کو معاذ اللہ بے دردانہ اور بے رحمانہ ثابت کیا جاتا ہے۔

تو اب وہ جتنا پھیلا کے۔ وہ اپنے مقصد کی خاطر اس کو پیش کریں میں بہر حال ان کی ترجمانی میں اس کو مختصر طور پر یوں کہہ سکتا ہوں کہ وہ...... ”ایک تو بیچارے کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا...... اب اسی ”بیچارے“ میں پوری خطابت مضمر ہے جتنا وہ اسے طاقتور کر کے پیش کریں گے اسی بیچارے کی مد میں موجود ہے...... ”ایک تو بے چارے کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا اور اس کے بعد طرہ یہ کہ اب وہ اپنی خاندانی میراث سے بھی محروم ہے اور چچاؤں کے رحم و کرم پر ہے تو کتنی بڑی بے رحمانہ شریعت کی گویا معاذ اللہ زیادتی ہے کہ یہ

قانون نافذ کیا گیا ہے۔"

یہ ہے خلاصہ......تو اس اعتراض کا......اس میں منطق کوئی نہیں ہے۔ صرف انسانی جذبات سے اپیل ہے تو اب پہلے تو میں یہ عرض کروں کہ اصل اصولی حیثیت یہی ہے کہ نظام میراث کو دیکھا جائے کہ وہ کس اصول پر مبنی ہے اور اس کے لیے پھر کلیتہً ایک جملہ یاد رکھیے کہ اصول جذبات کے پابند نہیں ہوتے۔ جذبات کے تقاضے الگ ہوتے ہیں۔ اصول کے تقاضے الگ ہوتے ہیں اور ایک بات اصول میں یہ ہے کہ اصول ایک رہنا چاہیے اُسے بدلنا نہیں چاہیے۔

میں کہتا ہوں کہ آپ میراث کو جذبات انسانی یعنی بیچارگی کے احساس پر مبنی کرنا چاہتے ہیں۔ تو پھر صرف پوتے کی میراث کو اس اصول پر کیوں جانچیے۔ پورے نظام میراث کو پھر اسی اصول پر جانچیے۔ اصول کے لحاظ سے جو فرق بیٹے اور پوتے میں ہے وہی فرق باپ اور دادا میں ہے۔ یعنی بالکل ایک درجے میں ہیں۔

یہ تو انسان کو بیچ میں رکھ کے دو خط جب کھینچیں۔ تو ایک خط اوپر جاتا ہے۔ ایک خط نیچے آتا ہے جو خط اوپر جاتا ہے وہ بلا واسطہ اُس کے باپ تک پہنچتا ہے اور جو خط نیچے آتا ہے وہ بلا واسطہ اس کے بیٹے تک پہنچتا ہے وہ باپ والا خط جب اور اونچا ہوتا ہے تو دادا تک پہنچتا ہے۔ یہ ادھر والا خط جب اور بڑھتا ہے تو پوتے تک پہنچتا ہے تو اگر ریاضی کے اصول پر نقطے قائم کیجیے الف۔ ب۔ ج۔ تو اس انسان کو الف قرار دے کر اُدھر والی "ب" جو ہوگی وہ باپ کی ہوگی اور ادھر والی "ب" بیٹے کی ہوگی۔ ادھر والا "ج" دادا کا ہوگا۔ ادھر والا "ج" پوتے کا ہوگا۔ تو اب پرکار سے ناپیے۔ یہاں کوئی جسمانی مسافت تو ہے نہیں کہ وہ پرکار لایا جائے۔ مگر اپنے ذہن کے پرکار سے ناپیے تو باپ کے مقابل میں ادھر بیٹا پڑتا ہے اور دادا کے مقابلے میں ادھر پوتا پڑتا ہے۔ تو اگر آپ کے اصول سے باپ کے بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو محروم کرنا غلط ہے تو اُسی طرح اُدھر باپ کے ہوتے ہوئے دادا کو محروم کرنا

غلط ہے۔ وہ برابر کے ہیں نا رشتے اور وہ بھی بلا تفریق فرقہ...... اس پر آپ کو بھی اعتراض نہیں۔ کہ باپ اور اولاد ہے طبقہ اولیٰ میں اور دادا دادی۔ نانا نانی اور بھائی یہ ہیں۔ طبقہ ثانیہ میں اور اصول یہ ہے کہ ہر طبقہ اولیٰ کے وجود میں طبقہ ثانیہ کو میراث نہیں ملتی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ میت کا اگر باپ موجود ہے تو دادا کو میراث نہیں ملے گی...... ماں موجود ہے نانا کو...... باپ یا ماں کوئی بھی ہے تو دادا یا نانا کو کسی کو میراث نہیں ملے گی۔ جیسے بھائیوں کو نہیں ملے گی ویسے ہی دادا اور دادی اور نانا اور نانی کو بھی نہیں ملے گی۔ طبقہ اولیٰ کی موجودگی میں طبقہ ثانیہ کو نہیں ملے گی۔ بے چارے پن کے اصول سے جانچئے۔ تو بسا اوقات بیٹے کے انتقال کے بعد باپ تو ریٹائر نہیں ہوا ہوگا۔ مگر دادا بیچارہ ضرور ریٹائر ہو چکا ہوگا۔ باپ ماشاءاللہ صاحب ذریعہ ہوگا معاش میں اور دادا جو ہوگا وہ بیچارہ اب عمر کی جس منزل میں ہو۔ تو وہ اس کے مقابل میں بیچارہ ہی ہوگا لہٰذا اگر بیچارے پن ہی پر میراث کی بنیاد ہے تو جس طرح خطہ تنسیخ اس پر کھینچئے اُسی طرح خط تنسیخ اس پر بھی کھینچئے۔ اصول بنایئے کہ نہیں بیچارے دادا کو میراث ملنا چاہئے اور ماشاءاللہ باپ جو ہاتھ اور پیروں والا ہے اس کو نہ ملنا چاہیے اُس وقت آپ کیوں خاموش ہیں؟ اچھا دو بھائی ہیں۔ فرض کیجئے اولاد نہیں ہے یا دونوں بیٹے ہیں۔ مگر ایک فطری طور کے اوپر بے دست و پا پیدا ہوا ہے...... نقص ہوتے ہیں بعض پیدائشی جس کی وجہ سے نہ وہ تعلیم حاصل کر سکتا تھا، اپنے ذہنی نقص کی وجہ سے، نہ وہ کسب معاش کر سکتا تھا۔ اپنے جسمانی نقص کی وجہ سے دوسرا بیٹا جو ہو وہ ماشاءاللہ ہر حیثیت سے مکمل...... اس نے تعلیم بھی حاصل کی۔ اُس نے اعلیٰ درجے کی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ تو اب ظاہر ہے کہ وہ بیٹا یا بھائی بیچارہ ہے اور یہ بے نیاز ہے یہ خود لکھ پتی ہے ایسا ہے کہ اس کو اتنی سی میراث ملنا اُس کو کوئی اس سے خاص فائدہ بھی نہیں پہنچے گا۔ تو یہاں اصول بنایئے کہ دو بیٹے ہیں۔ تو جو بیچارہ ہو۔ اُس کو میراث ملے اور جو چارہ کار والا ہے اُس کو میراث سے محروم ہونا چاہیے لیکن شریعت کا اصول یہ کہ جب قرابت میں دونوں برابر ہیں۔ دونوں بیٹے

ہیں یا دونوں بھائی ہیں تو جتنا حصہ اُس لکھ پتی کو ملے گا۔ اتنا ہی حصہ اس بیچارے کو ملے گا کوئی فرق ان دونوں میں نہیں ہوگا کہ وہ لکھ پتی ہے لہٰذا اس کو کیوں میراث ملے اور یہ غریب ہے لہٰذا اس کو میراث ملے۔ آپ نے کہا اچھا یہ بھی ٹھیک۔ اب سے اس ترمیم کا بھی مطالبہ کریں گے۔ ابھی تک سوجھی نہیں تھی۔ آپ نے منبر سے ہم کو بتلا دیا۔ تو اب یہ بھی ہم کہیں گے۔

تو میں کہتا ہوں کہ پھر بیٹے اور بھائیوں ہی کی کیا قید ہے۔ اب محلے میں دیکھئے کہ کون بے چارہ ہے، اور کون چارے والا ہے اب وہ چارہ نہ سمجھئے گا جو جانوروں کا ہوتا ہے۔ یہ چارہ جس سے بیچارہ ہوتا ہے تو کون چارہ کار کا مالک ہے۔ اب یہ ہماری اردو ہے کہ اضافت کے ساتھ کہیں چارہ کار کا مطلب سمجھ میں آجائے اور چارہ کہہ دیں تو پھر ذہن چلا جائے کسی اور طرف تو جناب چارہ اور ناچارہ کی یہاں قید نہیں ہے...... تو اب آپ محلے والوں کو میراث دلوائیے۔ جو بے چارہ ہو وہ دیکھئے۔ محلے والوں میں ماشاء اللہ سب بے نیاز ہوں تو شہر میں ڈھونڈیے کہ کون بیچارہ ہے تو پورا نظام پھر بدل جائے گا اور پھر میراث تو کوئی چیز ہی نہیں رہے گی۔ پھر وراثت کا قانون ہی ختم ہو جائے گا تو اب یاد رکھئے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ میراث کی بنیاد صاحب حیثیت ہونے اور پریشان حالی پر نہیں ہے۔

اسلام کے کچھ احکام ہیں جو ایک شخص کے فقر و استغنا اس کے متعلق ہیں کہ جو مستغنیٰ ہے وہ مستحق نہیں ہے۔ جو محتاج ہے وہ مستحق ہے وہ احکام الگ ہیں۔ وہ زکوٰۃ ہے خمس ہے اُس میں بے چارے اور لاچارے کو دیکھئے۔ مستغنیٰ اور غیر مستغنیٰ کو دیکھئے اس میں غنی اور فقیر کو دیکھئے۔ اس میں جو زیادہ صاحب حاجت ہو وہ زیادہ مستحق۔ جس اصول پر بنیاد اس نظام کی ہے اس اصول پر جانچیے ایک اصول میں دوسرے اصول کو نہ لائیے۔ قرابت کی بنیاد پر ہے میراث۔ میراث نام ہی ہے اُسی نظام کا جو بر بنائے قرابت ہوتا ہے۔ اگر قرابت کوئی چیز نہ ہوتی تو باب میراث ہی نہ ہوتا۔ نظام میراث ہی کی بنیاد قرابت پر ہے تو اب جب قرابت پر ہے تو قرابت کے اصول پر دیکھئے۔ اب چارہ اور بے چارہ کو بیچ میں نہ لائیے۔

اب یہ دیکھیے کہ کون زیادہ قریب تر ہے اور کون اُس سے کم قریب ہے۔ تو بالکل پہلے مجمل طور پر میں نے دو نام لیے تھے اب اس فلسفے کو دیکھ لیجیے۔

کہ اصل انسان سے سب سے زیادہ قریب تو اس کی ذات ہے اب ذات کو بیچ میں رکھ کے ایک خط جاتا ہے اوپر اور ایک خط جاتا ہے ادھر (نیچے) جو اوپر خط جاتا ہے وہ بلا واسطہ باپ اور ماں تک پہنچتا ہے جو نیچے خط جاتا ہے وہ بلا واسطہ بیٹے اور بیٹی تک یعنی اولاد تک پہنچتا ہے۔ اس لیے طبقہ اولیٰ میں ماں باپ ہیں اور اولاد خواہ بیٹے ہوں اور خواہ بیٹی ہو۔ وہ حصے کی مقدار کا فرق ہو وہ الگ بات ہے۔ وہ اس وقت زیر بحث نہیں ہے مگر یہ کہ اصل قرابت...... اولاد اور ماں باپ ایک طبقے میں...... یہی حقیقت ہے جسے قرآن مجید نے باپ اولاد کی میراث کے بعد کہا ہے۔

یہ باپ اور اولاد یعنی بیٹے اور بیٹی انہیں تم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کون زیادہ قریب تر ہے تمہارے لیے فوائد...... جو مفادات قرابت کے لحاظ سے...... یعنی یہ دونوں بالکل عقلی طور کے اوپر ایک طبقے میں ہونا چاہییں۔ اس کے بعد وہ جو اوپر خط گیا۔ باپ تک...... وہ خط...... اُس سے دو لکیریں کھینچیں۔ اب وہ لکیریں کاغذ پر تھوڑی ہیں وہ سب ذہن کے صفحے پر کھینچے لکیریں۔ کہ جناب اُس خط سے دو لکیریں کھینچیں۔ ایک لکیر اوپر کی طرف کھینچی وہ گئی اُس کے باپ تک ایک لکیر پہلو میں پہنچی وہ گئی اس کے بھائی اور بہنوں تک۔ یعنی باپ اور ماں کے بھائی بہن تک وہ برابر کی لکیریں کھینچی۔ جس کا مرکز اب وہ باپ یا ماں ہے۔ تو اب ایک طبقے میں ذہنی طور پر فاصلہ کے فاصلہ قرابت کے لحاظ سے ناپتے ہوئے اوپر والی جو لکیر گئی جو دادا دادی تک باپ سے پہنچی...... نانا نانی تک ماں سے پہنچی یہ پہلو میں (پہلو میں ابھی نہیں) اب اُن سے نیچے جو لکیر گئی...... دادا سے نیچے جو لکیر آئی...... تو وہ لکیر اوپر گئی تو دادا تک پہنچی تھی باپ سے...... اور نیچے آئی تو باپ کا بیٹا جو ہوا...... اُس کا نام ہوا بھائی...... یا ماں کا جو بیٹا ہوا...... اس کا نام ہوا بھائی...... تو اب قرابت کے رشتوں کے لحاظ سے...... فاصلے

کے لحاظ سے دادا دادی...... نانا نانی...... یہ اوپر خط جا کر جہاں پر ہوئے وہاں پر ادھر ہوا۔ (دادا کا بیٹا) باپ کا بیٹا...... وہ باپ کا باپ تھا دادا...... اب باپ کا بیٹا...... اور ماں کا بیٹا...... وہ باپ کا باپ تھا دادا...... اب باپ کا بیٹا...... اور ماں کا بیٹا...... وہ کون ہوئے اس کے بھائی ہوئے...... تو ایک طبقے میں ہوئے اجداد اور اخوا طبقہ ادنیٰ میں آباء و ابناء اور طبقہ ثانیہ میں اجداد و اخواء یعنی دادا دادی، نانا، نانی اور بھائی خواہ وہ باپ کے رشتے سے بھائی...... خواہ ماں کے رشتے سے بھائی خواہ دونوں کے رشتے سے بھائی...... غرض یہ کہ ایک طبقے میں ہوئے دادا دادی اور نانا نانی...... اب دادا سے جب خط کھینچا ادھر یا نانا سے خط کھینچا اُدھر تو ہوئے پردادا، پردادی، پرنانا اور پرنانی اور ان سے جب نیچے خط کھینچا یعنی دادا کا بیٹا...... وہ کون ہوا چچا...... نانا کا بیٹا وہ کون ہوا ماموں...... تو اب ایک طبقہ میں ہوئے کون اعمام اور اخوال...... تیسرے طبقے میں جیسے بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو میراث نہیں ملتی ویسے ادھر ہیں ایک ہی طبقے میں مگر پھر بھی دادا کے ہوتے ہوئے پردادا کو نہیں ملے گی حالانکہ وہ اور زیادہ بیچارہ ہوگا...... اور یہاں تیسرے طبقے میں ہیں ''اعمال اور اخوال'' اس لیے کہ ان میں باپ کے باپ کا بیٹا۔ یعنی دو واسطے ہو گئے قرابت میں (باپ کے) ماں کے باپ کا بیٹا وہ ہو گیا ماموں تو دو رشتے ہو گئے دو واسطے ہو گئے قرابت میں...... تو پورا نظام میراث قرابت کے اصول پر مبنی ہے۔ اُس میں آپ یہ بیچارے پن کو دخل کیوں دیتے ہیں جیسے باپ کے ہوتے ہوئے دادا کو نہیں ملتا ویسے بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو نہیں ملے گا۔ اب ہیں تو بہت ظاہر باتیں مگر ایک طبقے کو یہ حساب لگانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ مگر سوچیں تو سمجھ میں ہر ایک کی آجائے گا...... تو معلوم ہوا کہ بنیاد میراث کی اصولِ قرابت پر ہے استحقاق اور پریشان حالی پر نہیں ہے لہٰذا اس کو کیوں دخل دیجئے۔

اب میں تاریخ کی روشنی میں ایک حقیقت کی طرف متوجہ کروں گا۔ تمام دنیا میں جس میں اگر کوئی غیر مسلم ہو تو میں اس کو بھی مخاطب کر سکتا ہوں کہ صاحب ہم تو اس کو قانونِ الٰہی

مانتے ہیں۔ ارے جو قانونِ الٰہی نہیں مانتا۔ وہ قانون مصطفیؐ مانتا ہے۔ وہ پیغمبر خداؐ کی طرف کا قانون تو مانتا ہے تو اب میں...... میں سمجھتا ہوں کہ اگر منصف مزاج غیر مسلم ہو تو وہ میری بات پر غور کرے گا۔ میں کہتا ہوں کہ بقول آپ کے جس نے یہ قانون نافذ کیا ہے وہ خود اسی طبقے میں داخل رہا ہے جو محجوب ہے۔ یعنی وہ خود اسی دور سے گزرا ہے کہ دادا کی زندگی میں اس کا باپ دنیا سے اٹھ گیا اور اس لیے وہ خاندانی میراث سے محروم ہو گیا تو آپ اُن مصائب کو زیادہ سمجھ سکتے ہیں جو غیر متعلق ہو کے دوسرے کا دُکھ اپنے دل میں لائیں۔ یا جو اُس مشکلات سے گزرا ہے۔ وہ اندازہ کر سکتا ہے کہ باپ کے سر سے اُٹھنے کے بعد کیا پریشانیاں ہوتی ہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ الوہی رشتہ اُس کا نظر انداز کر کے بشری حیثیت سے واضع قانون رسولؐ کو قرار دے کر یہ سوچئے۔ تو سمجھ میں آئے گا۔ کہ اگر جذبات انسانی کو دخل ہوتا تو یہ رسولؐ ضرور قانون رکھتا کہ پوتے کو میراث ضرور ملنا چاہئے اس کی طرف سے قانون میں پھر اس نظام کا ہونا۔ یہ دلیل ہے کہ یا تو یہ بے بس تھا۔ اصل قانون کسی اور طرف کا تھا اور ہم یہی مانتے ہیں۔ اس بے بسی کو ہم نقص نہیں سمجھتے۔ کمال سمجھتے ہیں کہ لاکھ جذبات انسانی کے خلاف ہو۔ مگر وہ تو دوسرے کے وضع کردہ قانون کا پابند تھا۔ اُس کا کام تو صرف ترجمانی تھا اور یاد رکھئے کہ معصوم وہ نہیں ہے جس میں جذبات نہ ہوں۔ معصوم وہی ہے وہ جذبات کے ہوتے ہوئے فرائض کے مقابلے میں اس کو تہہ و تاج کر دے۔

اُس نے جب یہ قانون نافذ کیا تو وہ کیا جانتا نہیں تھا کہ پوتا اس حالت میں کیسا بے چارہ ہوتا ہے ارے اُس پر خود گزری ہوئی تھی تو یا تو بس یہی مانئے کہ وہ بے بس تھا۔ یا سمجھئے کہ ارادتاً وہ بہر حال اُس نے جس اصول پر مرتب کیا تھا۔ جذبات تو رکھتا تھا۔ مگر بے اصول آدمی نہیں تھا۔ لہٰذا پورے نظام کو اُس نے جس اصول پر قرار دیا تھا اُسی اصول پر اُسے بھی قرار دیا۔ جذبات کا اس میں کوئی دخل ہوتا تو وہ لحاظ کرتا کہ کیا گزرتی ہے پوتے پر...... کچھ گزرا کرے۔ لیکن اصول کا تقاضہ یہی ہے اور اب مجمل تو سبھی جانتے ہیں۔ مگر جو حقیقت

ہے اُس کو عرض کروں۔ آج تو معلوم ہے کوئی مجھے یاد بھی نہیں دلا سکتا تھا کہ آج جمعہ ہے تو بہر حال۔ وہ تو کبھی بدھ کو نماز جمعہ ہوئی ہو۔ اب تو غیر جمعہ میں جمعہ نہیں ہو سکتا۔ تو اب جمعہ تو آج بہر حال نہیں ہے اور آپ نے دیکھا ہی کہ کچھ وقت روز سے زیادہ تمہید میں صرف ہو ہی گیا۔

تو اب میں تاریخ کی طرف آپ کو متوجہ کروں گا وہ بیچارے پن کا آپ کا جو تصور تھا۔ رسولؐ سے بڑھ کے کون بے چارہ ہو سکتا ہے۔ کوئی یتیم ہوتا ہو گا کسی عمر میں اور پیغمبر خدا ﷺ مستند تاریخی روایات وہ یہ ہیں وہ دنیا میں پیدا ہی ہوئے یتیم۔ یعنی جب شکم مادر میں ہی تھے۔ اس وقت باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ دُنیا میں متولد ہی ہوئے یتیم اور جب باپ کی صورت ہی نہ دیکھی ہو تو ممکن ہے آدمی کو عام نظام کے تحت یتیمی کا احساس ختم ہی ہو جائے۔ مگر کیا نظام قدرت ہے کہ جناب اس یتیمی کی یاد خالق کی طرف سے ان کو قائم رکھی گئی۔ اس لیے چالیس برس کے بعد بعثت ہوئی اور اس کے کتنے دن کے بعد سورۃ اترا اُس سورہ میں کہا گیا تھا۔ الم یجدك یتیما۔ کیا ہم نے آپ کو یتیم نہیں پایا اور نہیں پایا...... کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو برابر یاد رہا ہے اپنا یتیم ہونا ہم کوئی نئی بات آپ کو نہیں بتا رہے ہیں۔ آپ کو خود یہ احساس قائم رہا ہے کہ آپ یتیم تھے۔ تو ہم نے یتیم پایا۔ تو اس آیت کو میں ابھی دُہراؤں گا۔ اس لیے یہاں آیت کو مکمل نہیں کرتا۔ کیا ہم نے آپ کو یتیم نہیں پایا۔ یہ یتیم ہونے کی یاد اس ابدی کتاب میں کیوں دلوا دی۔ میں سمجھتا ہوں اسی آج کے دن کے سدباب کے لیے۔ یہ یاد رکھنے کے لیے کہ دیکھو اس یتیم کے ذریعے سے یہ قانون دنیا تک پہنچا ہے اس لیے اپنے بے چارہ ہونے کے تصورات کو یہاں دخل نہ دو۔ اُسی یتیم کے ذریعے سے جس کے باپ کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا۔ اُسی کے ذریعے سے یہ قانون پہنچا ہے۔ اب جب باپ کا سایہ اُٹھ جائے۔ تو ہر شخص یوں بھی سمجھ سکتا ہے اور بعض لوگوں پر گزری بھی ہو گی کہ پھر ماں اپنے کو دُہری شفقت کا ذمہ دار سمجھنے لگتی ہے۔ جو ماں کی شفقت

اولاد پر ہوتی ہے وہ بھی اور پھر یہ احساس کہ بے باپ کا بچہ ہے۔ لہٰذا میرے سوا اور کون ہے مگر مرضی خداوند کہ ابھی چھٹا برس ہے عمر کا۔ کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اُٹھ جاتا ہے۔ اب جو یتیم الاب تھا اب وہ یتیم ابوین ہو گیا۔ جس کو ہم عرف عام میں...... ہمارے ہاں بعض لوگ ''لیسر'' کہتے ہیں۔ وہ ''لیسر'' عربی کے لحاظ سے کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس کو ''یتیم ابوین'' کہتے ہیں یعنی باپ اور ماں دونوں طرف سے یتیم...... یعنی بن باپ اور بن ماں کا بچہ ہو گیا۔ مگر دادا ابھی تک زندہ ہیں جناب عبدالمطلب...... اور اب اُن دادا نے اپنی کفالت میں لیا۔ وہ اب سرپرست بنے۔ انہوں نے پرورش کی...... اور کس شان سے...... طبقات ابن سعد میں روایت ہے جو قدیم ترین اس وقت ہمارے ہاتھ میں تاریخ ہے...... طبری سے بھی مقدم اور ابوحنیفہ دینوری سے بھی مقدم...... گو یوں تو مصر وغیرہ میں بھی چھپی ہے مگر ہالینڈ کا ایک شہر لیڈن ہے وہ لندن نہیں...... میں پہلے اُس کو لندن پڑھا کرتا تھا۔ اس میں یے کے نقطے نہیں تھے لگے ہوئے...... تو وہ کوئی شہر ہالینڈ کا ہے وہاں چھپی ہے طبقاتِ ابن سعد۔ تو اُس میں جناب۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ جناب عبدالمطلبؑ کی مسند ''فنائے کعبہ'' میں...... ''فنا'' کسے کہتے ہیں...... مکان کے دیوار کے آگے جو میدان ہو۔ اُس کو ''فنا'' کہتے ہیں۔ تو فنائے کعبہ میں۔ یعنی کعبے کی دیوار کے آگے جو میدان تھا اس میں دیوار کعبہ سے ملی ہوئی مسند ان کی بچھائی جاتی تھی۔

وہ سید البطحاء تھے۔ سردار قریش تھے۔ اس لیے وہاں گویا دربار اُن کا ہوتا تھا اور تمام عمائد ملک اور اعیان عرب وہاں جمع ہوتے تھے تو جب تک کہ جناب عبدالمطلب نہیں آتے تھے۔ اب یہ لفظیں میری ہیں۔ مگر مضمون سب وہیں کا ہے۔ طبقات ابن سعد کا حوالہ دے چکا کہ جب تک جناب عبدالمطلب نہیں آتے تھے۔ ان کے کسی بیٹے کی مجال نہ تھی کہ اُس مسند پر قدم رکھ دے۔ مگر اُس کمسنی کے عالم میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جب آئے تو سیدھے اس مسند کی طرف گئے اور بعض وقت ایسا ہوا کہ اولاد میں سے کسی نے ہٹانا چاہا گویا

جلالت جناب عبدالمطلب کے خیال سے اور اُدھر سے جناب عبدالمطلب آتے نظر آئے۔ اب اصل تاریخ کی لفظیں میں یہاں دہراؤں گا عربی کی...... کہ اُدھر سے جناب عبدالمطلب آتے نظر آئے...... انہوں نے دیکھا کہ یہ جا رہا ہے اُس کسنی میں اور میرا کوئی بیٹا ہٹانا چاہتا ہے۔ تو پکار کے کہا...... ارے اسے چھوڑ دو...... اس کی بڑی شان ہے بس معلوم ہو گیا کہ دادا پوتے کی پرورش نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک عارف شان ایک صاحب شان کی پرورش کر رہا ہے۔

مگر قدرت کا انتظام کہ ابھی آٹھ برس کی عمر ہے کہ وہ دادا کا سایہ بھی سر سے اٹھ جاتا ہے۔ یعنی دو ہی برس تو گویا بیچ میں فاصلہ ہوا چھٹے برس ماں کی وفات ہو گئی تھی۔ آٹھویں برس اب وہ دادا کی بھی وفات ہو گئی...... اب جناب عبدالمطلب اُن کے دس بیٹے ہیں اسی لیے ان کا لقب ابو السیادۃ العشر۔ دس سیدوں کے باپ اور یہ لقب سید جناب عبدالمطلب ہی سے چلا ہے...... وہ سید البطحاء تھے تو اُن کے بیٹوں کو دس کی تعداد کے لحاظ سے سامنے رکھ کے کہا کہ ابو السیادۃ العشر دس سرداروں کے باپ۔ اب وہ دسوں وفات کے قریب گرد و پیش جمع ہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی اس کمسنی میں ابھی آٹھ برس کی عمر ہے سامنے موجود ہیں۔ تو اب دس ہیں سامنے مگر ایک کو پکارتے ہیں اور اُس کو بلا کے کہتے ہیں کہ اب تک میں نے اس کی کفالت کی...... اب میں اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ بس ہر صاحب عقل مسلمان سے تاریخ دان سے میں کہوں گا وہ صاحب نظر جو آٹھ برس کی عمر میں بچے کے مستقبل کی شان کو سمجھ لے وہ کیا اپنی اولاد کی حالیہ شان کو نہیں سمجھتا تھا۔ تو آخر یہ دس میں ایک ہی...... وہ کون...... جناب ابو طالبؑ...... ان کو منتخب کرنا کہ تم اس کی کفالت کرنا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جانتے تھے کہ جس شان کا عارف میں ہوں۔ اُس شان کا عارف میری اولاد میں سے صرف یہ ہے۔

اور اب قدرت کا انتظام کہ اب ان کی کفالت جو ہے اس کی عمر اتنی طولانی ہوئی کہ

عام بشری نظام کے لحاظ سے میں کہہ رہا ہوں کہ انہی کے زیرِ تربیت اب بچپنا جوانی سے گلے ملا...... اب وہ جو آٹھ برس کا تھا...... اس وقت وہ بچہ تھا اور اب یہ عمر اتنی طولانی ہوئی کہ وہ جوانی کے حدِ کمال تک پہنچا۔ تو ان کے زیرِ تربیت طفلی اور شباب نے آپس میں معانقہ کیا۔ بچپن اور جوانی گلے ملے اور پھر ایک مکتبِ خیال کی زبان میں کہوں کہ آگے بڑھ کے انہی کی تربیت کے درمیان بشریت رسالت سے گلے ملی۔

اب اتنی عمر...... ان کی طولانی ہوئی کہ ابھی تک جو محافظ ذاتِ رسولؐ تھا۔ وہ اب محافظ پیغامِ رسولؐ ہو گیا اور جو اب تک شخصیت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لیے آفاتِ زمانہ سے سینہ سپر تھا۔ وہی اب بحیثیت پیغمبرانہ کے پیغام کے اجراء میں مخالفین اسلام کے مقابلے میں ان کا سینہ سپر ہو گیا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ذاتِ رسولؐ کا قلعہ بھی تھا اور بحیثیت پیغمبر اب وہ پیغمبر کا قلعہ بھی بن گیا۔

تو اب قرآن نے کہا...... کیا ایسا نہیں ہوا کہ اللہ نے آپ کو یتیم پایا تو آپ کو پناہ دی...... عام ترجمہ ہوتا۔ پناہ دلوائی...... فعل غیر جو ہو...... تو وہاں پناہ دلوائی کہنا چاہیے۔ مگر خالق یہ نہیں کہہ رہا ہے وہ کہہ رہا ہے آپ کو یتیم پایا تو اُس نے آپ کو پناہ دی۔ اب مجھے تاریخ کی رفتار معلوم ہے میں نے سب منزلیں پیش کر دیں۔ مگر بلا تفریق فرقہ۔ ہر نقطۂ نظر کی تفسیر کو دیکھیے تو ابو طالب نے آپ کو پناہ دی، کے تحت میں ماں کا نام کوئی نہیں لیتا۔ اس لیے کہ وہ پناہ ہی کون...... اللہ کی طرف کی۔ جو راستے میں ساتھ چھوڑ دے۔ اب چھ برس میں جو سایہ اُٹھ گیا۔ اُس کو اللہ پیش کرے گا؟...... اب کوئی دادا کا نام نہیں لیتا۔ اس لیے کہ وہ پناہ ہی کون...... اللہ اس کا احسان قائم کر رہا ہے۔ اپنا احسان گویا جتا رہا ہے اور وہ اس پناہ کو یاد دلائے گا جو دو برس تک رہی؟ ہر نقطۂ نظر کا مفسر مجبور ہے کہ ''آوی'' متن قرآن اور شرح میں لکھ دے گا۔ آوی یعنی چچا ابو طالب کی گود...... اللہ کے جملے کا ترجمہ اس پر ختم ہو گیا تھا۔ اس نے یتیم پایا اس نے آپ کو پناہ دی نہیں؟ اب یہاں مجبور ہیں لکھنے پر شرح میں

کہ ان کے چچا ابوطالبؑ کے ذریعے سے۔ تو اب غور فرمایئے کہ پناہ دینا فعل ابوطالب ہوا تاریخ کی نگاہ میں اور قرآن کی زبان میں اللہ کا پناہ دینا ہے۔ حضور بڑی بلند منزل ہے یہ کہ کسی اور کا کام ہو اللہ اپنا قرار دے۔ وہ یہ نہیں کہہ رہا ہے پناہ دلوائی۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ نے پناہ دی۔ تو اب جناب ابوطالب نے پرورش اُس بچپن میں کس طرح کی۔ اُسے بھی وہی قدیم ترین مورخ ابن سعد...... نام تو آپ کے لیے ذرا وحشت ناک ہوگا مگر یہ محمد ابن سعد ہے تو جناب والا۔ یہ ابن سعد ہی لکھ رہا ہے کہ جناب ابوطالب نے کس شان سے پرورش کی یہ الفاظ اب پھر دھراؤں تاریخ ہی کے کہ...... کیا معنی اور ذرا اگر گہری نظر سے غور کیجئے کہ یہ کارنامہ جناب ابوطالبؑ کا اتنا نہیں ہے جتنا یہ کارنامہ فاطمہ بنت اسد کا ہے ارے وہ علی ابن ابی طالبؑ کے والد ہیں اور یہ جناب علی ابن ابی طالبؑ کی والدہ ہیں۔ تو یہ جو مورخ کی نگاہ نے پہلو محسوس کیا ہے عام بشری نظام میں اس کا تعلق جناب ابوطالب سے اتنا نہیں ہے جتنا جناب فاطمہ بنت اسد سے ہے۔ وہ ترجمے سے آپ محسوس کریں گے کہ وہ مورخ لکھتا ہے اور ایسی نمایاں چیز تھی کہ وہ جزو تاریخ بنی۔ ہر نگاہ نے اُسے محسوس کیا کہ خود حضرت ابوطالب کی اولاد اکثر اس طرح نظر آئی ہے کہ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ چہرہ غبار آلود ہے جیسے گھر میں بچے رہتے ہیں۔ اکثر بحال پریشان غبار آلود خود ابوطالب کی اولاد نظر آئی ہے مگر محمد مصطفیٰ ﷺ جب نظر آئے تو آنکھوں میں کاجل لگا ہوا اور بال آراستہ و پیراستہ۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دم کیلئے کسی کے ذہن میں احساس پیدا نہیں گویا ہونے دیا کہ بے باپ کا بچہ ہے ایک لمحے کیلئے۔ کسی کے ذہن میں۔ بلکہ دنیا نے اس کو غیر معمولی چیز محسوس کیا۔ جو جزو تاریخ بنی۔ کیونکہ تاریخ کا جزو وہی چیز بنتی ہے جو غیر معمولی ہو۔

جیسے اخبار کا جزو...... جو معیار اخبار کا ہے حالیہ خبروں کے لیے۔ وہ معیار تاریخ کا ہے گزشتہ خبروں کے لیے۔ تو میں نے ایک دفعہ اخباری معیار...... اخباری خبر کا معیار اخبار ہی میں پڑھا تھا تو کسی نے پوچھا کسی ماہر اخبار سے کہ بھئی اخبار میں آنے کے قابل کون خبر

ہوتی ہے۔ اُس نے کہا بس یہ سمجھ لو کہ کتا آدمی کو کاٹ لے تو یہ اخبار میں آنے کی کوئی خبر نہیں ہے اور آدمی کتے کو کاٹ لے تو بس یہ چیز اخبار میں آنے کی ہے۔ اب آپ نے سمجھا کہ غیر معمولی بات جب تک نہ ہو۔ اس وقت تک وہ 'جزو تاریخ' یا جزو اخبار نہیں بنتی ہے تو صاحب بھلا کون غور سے بچوں کو دیکھا کرتا ہے کہ کون کس حال میں نکلا اور کون کسی حال میں نکلا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا اشتیاق سے دیکھتی تھی کہ یہ بن باپ کا بچہ بھی کبھی پریشاں حال نظر آتا ہے۔

اور بس میں ایک جملے سے اپنے موضوع کے ساتھ اس تاریخ تذکرے کو مربوط کروں۔ میں کہتا ہوں کہ پیغمبر اسلامؐ انہوں نے قانون وہ رکھا کہ گویا قیامت تک کے لیے نگاہوں کو اپنی سیرت کے ذریعے سے بھی موڑ دیا کہ دیکھو قانون تو یہ ہے کہ بیٹوں کے ہوتے ہوئے پوتا محروم ہے۔ مگر دیکھو یہ مثال بھی یہیں سے لینا کہ چچاؤں کو وہ کرنا چاہیے جو ابو طالب نے محمد مصطفیؐ کے ساتھ کیا۔

اب میں تو کہتا ہوں کہ قرآن احسان شناس تھا کہ اُس نے جناب ابو طالب کا تذکرہ قیامت تک کے لیے ضروری سمجھا۔ ان لفظوں میں اور پھر ایک دوسرے جملہ بھی یاد دلا دوں۔ کہ اسی سورہ میں اور اکثر علماء کا خیال ہے کہ الم نشرح اور والضحیٰ ایک سورہ ہے ایسے سوروں میں احتیاط نماز میں یہ ہے کہ ہر سورہ پڑھیں یہ سورے احتیاط یہ ہے کہ سورہ حمد کے بعد پڑھے ہی نہ جائیں جن میں اختلاف ہے کہ ایک ہیں یا دو ہیں اور وہ دو سورے یہ ہیں۔ وضحیٰ اور الم نشرح۔ کیونکہ ایک صاحب نے اس دن مسئلہ بھی پوچھا تھا کہ ایک امام جماعت صاحب نے...... انہوں نے گویا غیر معمولی طور پر بیان کیا کہ لایلف قریش اور فیل دو سورے پڑھ دیے سورہ حمد کے بعد نماز میں...... تو خیر کوئی اور ہوتا تو...... وہ کیونکہ ایک دوسرے مولوی کا ذکر تھا تو اُسے غلط قرار دیتا...... تو میرا تو ظاہر ہے کہ یہ شعار نہیں جو میں صحیح پہلو اُس کا ہے وہ عرض کر دیا اُن سے کہا پیش نماز صاحب مقلد کسی ایسے عالم کے ہوں گے

جو ان دونوں سورتوں کو ایک سمجھتا ہے۔

اکثر علماء قائل ہیں کہ لایلف قریش اور فیل ایک سورہ ہیں ویسے ہی اکثر علماء قائل ہیں والضحیٰ اور الم نشرح۔ یہ دونوں ایک سورہ ہیں۔ مگر میں نے عرض کیا احتیاط یہی ہے کہ ان سوروں کو نماز میں پڑھا ہی نہ جائے۔ کیونکہ ایک پڑھا تو شبہ رہتا ہے کہ نامکمل ہو گیا ہو اور اگر دو پڑھے تو شبہ ہو گا کہ دو سورے ہو گئے ہوں اور قیام بھی ناجائز ہے نماز میں...... حکم ایک سورہ کا ہے...... تو اتنی بھی ترمیم نہیں جائز...... اور کوئی کہے کہ دو سورے پڑھ لے تو اور زیادہ تلاوت قرآن ہو گئی تو جی شریعت میں آپ کو اپنی عقل سے بھی دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ جو حکم ہوا ہے اس پر عمل کیجئے۔ اگر آپ کو سورہ میں اضافے کا حق ہوتا کہ دو سورہ پڑھ دیں تو کیا کہنا اور اگر پورا قرآن پڑھ دیں تو کیا کہنا...... تو اگر یہ آپ کے کیا کہنے سے ہوتا تو صبح کی دو رکعت کے بجائے چار پڑھ دیں تو کیا کہنا...... اور ظہر کی چار کے بجائے آٹھ پڑھ دیں تو کیا کہنا...... جی ہاں تو نہ آپ کو کمی کا حق...... نہ آپ کو زیادتی کا حق...... یہ سمجھئے کہ قانون کسی اور کے ہاتھ کا ہے۔ ہمیں تو اس کی اتباع کرنا ہے۔ جب پیغمبر کو یہی حکم ہے کہ اتباع کرو۔ تو ہمیں ایجاد کا کیا حق ہے؟

ہاں تاریخ کا جزو ہے کہ مسجد کوفہ میں محراب کے اندر زمانہ راشدہ میں ایک گورنر صاحب نے صبح کی نماز ایک خاص حالت بے ہوشی میں دو کے بجائے چار پڑھا دی اور صف جماعت میں صحابہ بھی موجود تھے۔ مگر بیچاروں نے پڑھ لی۔ دو کے بجائے چار...... اُس وقت دو تھی عبادت کی تو پھر مڑ کر پوچھا کہ کچھ اور اضافہ کر دوں۔ یعنی اس وقت گویا ذھن ہے میں انگریزی لفظ استعمال نہیں کرتا ہوں۔ مگر کیا کروں کہ اُس کے ہم معنی مجھے اُردو میں معلوم نہیں۔ لہٰذا اسی سنائی لفظ سہی کہ اس وقت موڈ ہے عبادت کا...... تو کچھ اور اضافہ کر دوں تو اب کتنے صحابہ ہونگے ان کے نام تاریخ میں آئے نہیں۔ اب جو بے چارے بول دیے اس وقت۔ انہی کا نام آ گیا کہ ان صحاب نے کہا...... ارے بس کافی ہے۔ آپ کے

ساتھ تو ہم زیادتی ہی میں رہے ہیں۔ لہذا بس جتنی زیادہ ہو چکی وہ کافی ہے تو غرض یہ کہ یہ دو سورہ پڑھنا یہ بھی ناجائز مبطل نماز ہوگا۔ تو اب اس لیے بہتر یہی ہے کہ دو خطروں کے بیچ میں جب ہم ہیں تو حتی الامکان اس خطرے سے بھی بچیں۔ اُس خطرے سے بھی بچیں۔ تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ ضرورت کیا ہے انہی سورتوں کی......کوئی اور ہی سورہ پڑھ لیں جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تو غرض یہ کہ جہاں پر یہ کہا گیا کہ......کیا ہم نے آپ کو یتیم پایا تو پناہ نہیں دی؟ تو اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ......ہم نے آپ کو تہی دست پایا تو ہم نے آپ کی دولت مندی کا۔ استغنی کا سامان کیا۔ اب جس طرح جزو تاریخ وہ ہے ہر مورخ ہر مفسر لکھنے پر مجبور ہے کہ پناہ دی ابو طالب کی وجہ سے۔ ویسے ہی یہاں ہر مورخ لکھنے پر مجبور ہے کہ غنی بنایا خدیجہ کی دولت سے اور بعدل الٰہی میں کہتا ہوں کہ اگر ایک کے باپ کا نام لیا تو ایک کی ماں کا نام لیا۔

اب کتنا مقدس تھا وہ عمل جو بشر کا عمل تھا مگر خالق بشر نے اپنا عمل کہا اور کتنی پاک تھی وہ دولت، جو کسی کی تھی مگر اللہ نے اُس پیسے کے ذریعے سے اپنا احسان جتلایا کہ ہم نے آپ کو غنی کیا اور بہر حال یہ خالق کی احسان شناسی تھی۔ ارے اس کے رسولؐ پر احسان تھا تو اسے وہ مانتا ہے۔ اس کے دین پر احسان تھا تو اُسے وہ مانتا ہے یوں براہ راست خالق پر کون احسان کرے گا۔ تو خالق کی احسان شناسی تھی اور خود رسولؐ کی طرف سے امکانی احسان شناسی خدائی قسم تھی وہ یعنی بحکم الٰہی کہ انہوں نے مجھے پالا تو میں ان کے فرزند کی پرورش کروں گا۔ وہ تو ظاہر ہے کہ ان کا کوئی کام بغیر مرضی الٰہی نہیں ہوتا۔ اصل میں تو حکم الٰہی تھا۔ مگر ظاہری بشری اسباب سے اب عمر پوری صرف کی پیغمبرؐ نے گویا ابو طالبؑ کے احسان کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے۔ ابو طالبؑ نے میری پرورش کی۔ اب میں ان کے فرزند کی پرورش کروں گا۔ ان کے ہوتے ہوئے سہی۔ ابتداء سے اب سب ابو طالبؑ کے زیر تربیت

ہیں۔ باپ موجود ہیں مگر علی ابن ابی طالب زیر تربیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور اب پھر مجھے وہی...... آج مجھے ابن سعد ہی یاد آرہا ہے تو وہی طبقات ابن سعد۔ اس میں بھی اصل واقعہ ہے اور وہ جملہ تو نہج البلاغہ میں ہے۔ تربیت رسولؐ تو ہر تاریخ میں موجود۔ مگر یہ جملہ نہج البلاغہ کا ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اپنے اس بچپن کا حاصل اس طرح لکھتے ہیں۔ چھ سات برس کی ان کی بھی عمر جب وہ زیر تربیت ابو طالبؑ آئے ہیں تب ان کی بھی عمر آٹھ برس ہے اور یہ بھی اب (8'7 برس کے ہیں) چھ سات برس کے ہیں اور ابھی ظاہر ہے تشبیہیں وہ ہر ملک کے لحاظ سے الگ الگ ہوتی ہیں لہٰذا ہم اپنے ہندوستانی تہذیب کے مطابق اُس تشبیہ کو نہ جانچیں جہاں کی تشبیہ ہے وہاں سے دیکھیں...... سندھ کے جو خاص لوگ اُس وقت کے ہوں۔ انہوں نے شاید اُس کا زیادہ مطالعہ کیا ہو' اس مخلوق کے حالات کا' تو عرب کی زندگی سے' اب تو ماشاءاللہ ملی جلی تہذیب یہاں کی ہوگئی۔ ورنہ اُس وقت میں عربیت یہاں بہت نمایاں تھی۔ عربی تہذیب یہاں اور عربی ماحول بھی عربی فضا بھی۔ یہاں بھی اسی طرح کا ریگستان اور یہاں کی بھی پیداوار اسی طرح کی۔ تو حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام وہاں کی زندگی کے لحاظ سے، جو سندھ کے لیے عجیب نہیں ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ...... میں پیغمبرؐ کے پیچھے پیچھے اس طرح رہتا تھا...... جیسے اونٹنی کا بچہ اونٹنی کے پیچھے پیچھے...... اب جس نے اس جانور کا مطالعہ نہ کیا ہو...... وہ پورے طور سے اُس کو نہیں سمجھ سکتا کہ یہ نسبت کتنی تام ہے...... وہ جدا نہیں ہوتا...... پیچھے پیچھے بالکل چلتا تھا...... جیسے کہ بچہ ناقے کا...... ناقے کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اب یہ تشبیہ تو اُس ہمہ وقت حاضری اور ہمہ وقت پیچھے رہنا۔ یہ اُس کے لحاظ سے اور اپنا خصوصی احساس اُس وقت کا...... میں نبوت کی روشنی دیکھتا تھا۔ یہ قبل بعثت...... میں نبوت کی روشنی دیکھتا تھا اور رسالت کی خوشبو سونگھتا تھا۔ میں کہتا ہوں جو قبل بعثت، نبوت کی روشنی دیکھ رہا ہو اور رسالت کی خوشبو سونگھ رہا ہو۔ اُس کے لیے کیوں سوال پیدا ہو گا کہ کب ایمان لایا۔

تو میں کہتا ہوں، جس طرح میرے ایمان میں قبل بعثت بھی رسولؐ پیغمبر تھے اور کوئی مانے نہ مانے لیکن خود اُس صادق کی زبان سے جو سن چکا ہو کہ...... میں اُس وقت بھی نبی تھا جب آدم کا پتلا آب و گل میں تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا منصب اُس وقت نہیں ملا جب بعثت ہوئی بلکہ اظہارِ رسالت پر مامور اُس وقت ہوئے۔ یہ جملہ کہ میں کہتا ہوں کہ جس حد تک رسولؐ اس وقت نبی تھے اُسی حد تک یہ مومن تھے اور جس معنی سے وہ آج رسولؐ ہوئے اُس معنی سے انہوں نے آج ایمان اختیار کیا۔

جب تک اُن کی رسالت پردہ غیب میں، اس وقت تک ان کا ایمان پردہ غیب میں...... جب رسالت بے حجاب ہو کر سامنے آئی...... جب اُس رسالت کا وقت ظہور آیا...... تو ان کا ایمان عالم ظہور میں آ گیا...... اب ان کی کیا عمر دس برس...... تو بلاشبہ جیسے آٹھ برس کی عمر میں آدمی بچہ ہوتا ہے ویسے ہی دس برس کی عمر میں بھی بچہ ہی ہوتا ہے...... اب دنیا اس وقت کی عمر کو دیکھ رہی ہے اور حق ہے دیکھنے کا...... اب ایمان کا انکار تو نہیں کر سکتی...... لیکن کہتے ہیں بچپنے میں ایمان لائے...... مجھے بھی بچے کو بوڑھا بنانے کا شوق نہیں ہے...... جو بچہ ہے وہ تو بچہ ہی ہے مگر یہ دیکھنا ہے کہ کیسا بچہ ہے ایسا بچہ ہے کہ اُس کے ایمان کو خدا اور رسولؐ نے معتبر سمجھا...... اب آپ اگر مسلمان ہیں تو فیصلہ کیجئے کہ آپ معتبر سمجھئے کہ نہیں اور میں کہتا ہوں دو اور دو کا مجموعہ جیسے چار۔ اگر اُس وقت کے ایمان کو معتبر نہیں سمجھا۔ تو دنیا ثبوت پیش کرے کہ بالغ ہونے کے بعد کچھ رسولؐ نے مطالبہ ایمان کیا ہو۔

معلوم ہوا کہ ساری عمر کے کارنامے اُسی بچپن کے ایمان والے کو ملے ہیں۔ جتنے رسولؐ سے رشتے قائم ہوئے ہیں۔ سب اُسی بچپن کے ایمان پر ہیں۔ تو جس پر ایمان ہے تو وہ تو اُسے معتبر سمجھتا ہے۔ اب آپ بیرونی ہو کے جو رائے چاہے قائم کیجئے اور اس کے بعد اب دس برس کے ہیں تب ایمان اختیار کرتے ہیں آپ کی زبان میں اور اب تیرہ برس کے ہیں تو وہ معاہدہ ہوتا ہے۔ جس کا نام ہے بیعت ذوالعشیرہ...... تین برس کے بعد وہ دعوت

ذوالعشیرہ ہوتی ہے اور دعوت ذوالعشیرہ میں اب جو اُس وقت دس برس کا تھا...... وہ تین برس میں کیا ہوتا ہے...... تیرہ برس کا تو تیرہ برس کا ہو کے بھی تو بچہ ہی رہتا ہے، بوڑھا تو نہیں ہو جاتا اور اب وہ کہتے ہیں کون میری مدد کرے گا اور مجمع سے یہ کھڑے ہو گئے اُسے تفصیل سے تو نہیں عرض کرتا۔ آپ کو بحمد اللہ تفصیل سے معلوم ہے۔ کون میری مدد کرے گا اور یہ مجمع میں سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ "جی میں" رسول کہیں تم بچے ہو...... بیٹھ جاؤ...... بچہ کہہ کے تو نہیں بٹھلاتے اور معاہدہ ہے قانونی چیز اور بچہ کہہ کے وہ نہیں بٹھلاتے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ اچھا پھر دیکھو...... یہ ہے جس نے معاہدہ کیا اور جتنے اُس کے نتیجے ہیں اس کو اس وقت نہیں پیش کرنا ہے۔ آپ کا تو دل چاہتا ہو گا کہ پیش کروں۔ لیکن اُس سب کو نہیں کہنا ہے وہ لفظیں یاد ہیں۔ حفظ ہیں تاریخ میں متفق علیہ کہ آپ کہہ دیتے ہیں کہ دیکھو یہ ہے، تو اب رسول نے...... بچے تھے مگر ذمہ دار بچہ سمجھا اور اب باپ جو تھا وہ تیرہ برس کا تھا یا یہ کہ اسلام کے سوال کے وقت پر دس برس کا تھا، تو دس برس اور تیرہ برس میں وہ اُس کی نظر میں ذمہ دار فرد تھا اور مباہلے کی منزل میں اب بیٹے" جو ہیں چھ اور سات برس کے ہیں اور وہ گواہ رسالت بن کر آتے ہیں اور یاد رکھیے کہ میں نے چھ اور سات انتہائی کہے یعنی وفات رسول کے وقت ایک چھ برس کا تھا ایک سات برس کا اور مباہلہ ظاہر ہے اس سے پہلے ہوا ہے اور بہر حال ایک اُس میں سے اپنے پیروں چل رہا تھا اور ایک کو پیغمبرؐ اپنی گود میں لائے تھے ایسا تھا کہ رسولؐ اپنی گود میں لائے تھے۔ یعنی اور سب کے لیے تو لیجانا مجاز ہے اس کے بارے میں پہنچانا حقیقت ہے تو یہ روحانی مقابلہ اس میں سات اور آٹھ برس کے بچے اور وہ گواہ رسالت بنا کے لائے جا رہے ہیں...... اور یوں کہوں کہ جزو جہاد روحانیت بنا کے لائے جا رہے ہیں۔

تو بس میں اب زیادہ دور نہیں جاؤں گا...... یہ بھی ایک جہاد تھا...... جس میں حسنینؑ شریک کیے گئے تھے مگر وہ چند برس کے تو تھے ہی چاہے وہ چھ برس کے ہوں چاہے سات برس کے ہوں...... کچھ برس کے تو تھے ہی...... لیکن اب مجھے ایک جہاد ایسا نظر آ رہا ہے کہ اُس جہاد

میں شریک ہونے والے کی عمر میں برس کا نام ہی نہیں آتا وہ کون...... جہادِ کربلا...... علی دعوت ذوالعشیرہ میں تیرہ برس کے اور حسنؑ و حسینؑ معرکہ مباہلہ میں چھ اور سات برس کے۔ تو ارتقا تو ہو رہا ہے مگر یہ ارتقا عددِ سال میں میں دکھلا رہا ہوں اور اب کربلا میں جو آتا ہے جزو جہاد ہو کر، اُس کی عمر تو پیدائش چھ مہینے ہے علیؑ اصغر کے نام کے ساتھ ''ششماہا'' تقریباً جزو ہے اور یہاں عمر کے لحاظ سے سال کا نام ہی نہیں اور جب ہم تاریخ میں مدتیں دیکھتے ہیں۔ تو کچھ عجیب حقیقت سامنے آتی ہیں۔ مولاؑ کا سفر مدینے سے کب...... 28 رجب کو دس محرم کو شہادت...... چھ مہینے ہی تو ہوئے اور شہزادے کی عمر کتنی...... چھ مہینے...... تو میری سمجھ میں تو ایک حقیقت آئی...... اس سے وہ یہ کہ جیسے رسالت پیغمبرؐ منتظر رہی...... اُن علی کے ایک عمر تک پہنچنے کی...... ویسے ہی اقدام حسینؑ منتظر رہا...... اس علیؑ کے دنیا میں آنے کا...... ہیں دونوں علیؑ...... بس یہ علیؑ دنیا میں آیا اور مولاؑ نے قدم اُٹھا دیا جہادِ کربلا کے لیے...... اب وہ قدرت کی طرف سے اسباب اُسی وقت فراہم ہوئے لیکن بہر حال بس یہ علیؑ...... اب میں نہیں کہہ سکتا۔ کربلا میں جو چھ مہینے کا ہوگا وہ اُس وقت کے دن کا تھا' جب سفر ہوا تو یہ کے دن کے تھے۔ اب جو تاریخ میں نہیں بتایا اُسے میں کیا کہوں۔ مگر بس یہ سمجھ میں آتا ہے کوئی کم سے کم کوئی مہینہ نہیں تھا عمر کا۔ ورنہ کربلا میں سات مہینے کے ہوتے۔ نہیں چھ مہینے ہے سفر حسینؑ کی عمر اور چھ مہینے شہزادے کی عمر...... اب کتنے دن کے تھے یہ نہیں بتلا سکتا اور اب ایک جملہ ہے آپ کے لیے وہ عظمت شہید کے سمجھنے کیلئے بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ دفترِ مصیبت بھی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تو دنیا میں آئے تھے فقط جانے کے لیے...... اس کا مطلب یہ ہے کہ حسینؑ کے سفر کی ہر منزل علیؑ اصغر کی عمر کا ایک دن ہے اور بس جب مولا کا سفر اختتام کو پہنچا تو علیؑ اصغر کی عمر انتہا تک پہنچی۔ اب میں ظاہری حیثیت سے کہہ رہا ہوں کہ عمر ان کی انتہا تک پہنچی اور میں کہتا ہوں کہ ایک عمر ختم ہوئی اور ایک عمر کا آغاز ہوا اور اب حقیقت جانی پہچانی آپ کی ہے۔ آپ کے لیے عزا کے واقعات کو پھیلا کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ کربلا کے دن تک تو مجھے معلوم ہے کہ کون اکبر تھا اور کون اصغر...... مگر کربلا کے بعد تو جو عمر علی اکبر کی ہے وہ عمر علی اصغر کی ہے...... اب وہ اکبر اور اصغر کا فرق اب عصر عاشورہ کے بعد نہیں رہا اور میں کہتا ہوں کہ اکبر کی اُس عمر سے تو واقف شاید کوئی ایک طبقہ ہی ہو...... مگر یہ اصغر کی عمر جو ہے یہ تو ہر نقطہ نظر کا انسان اس میں مذہب و ملت کا بھی سوال نہیں ہے۔

اور بس اب اس مجاہد کی عظمت کا دوسرا پہلو آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ وہ یہ کہ ایک صاحب نے اُٹھ کر یہ سوال بھی کیا وہ شاید میرے اُن بیانات میں شریک نہیں ہوئے جس میں میں نے اس پہلو کو پہلے بھی روشن کیا کہ کربلا میں ترتیب شہدا پورے تاریخ اسلام کے اصول کے خلاف تھی۔ تاریخ اسلام میں ہمیشہ عزیز آگے رکھے گئے۔ اصحاب پیچھے رکھے گئے۔ اس لیے امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے کہ جب سخت وقت ہوتا تھا تو مولا یعنی رسول اللہ اپنے عزیزوں کو آگے رکھتے تھے۔ اصحاب کو پیچھے رکھتے تھے۔ مگر کربلا کا میدان پہلا موقعہ ہے تاریخ اسلام میں کہ یہاں اصحاب پہلے رکھے گئے ہیں...... عزیز بعد کو رکھے گئے ہیں...... کیا میں تاریخ اسلام سے واقف ہوں اور معاذ اللہ حسینؑ جن کے گھر کی چیز تھی وہ تاریخ اسلام سے واقف نہیں تھے...... پھر کیوں فرق ہے؟ یاد رکھئے کہ ہر جنگ میں چونکہ یہ طے شدہ ہوتا تھا کہ کچھ شہید ہوں گے...... کچھ بچ جائیں گے تو وہاں اگر اصحاب آگے رکھے جاتے اور عزیز پیچھے رکھے جاتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیروں کو کٹوانا ہے۔ اپنوں کو بچانا ہے کربلا کے میدان میں یہ تو طے شدہ تھا کہ جو خیموں کے باہر ہیں اُن میں بچنا تو کسی کو نہیں ہے امکانات حیات تو شب عاشور کے خطبے میں ختم کیے جا چکے تھے۔ کربلا میں صورت واقعہ یہ تھی کہ جو پہلے چلا گیا۔ اس کی مسافت مصیبت مختصر ہوگئی۔ جو زیادہ وقت تک رہا اُس نے شدت وقت کا زیادہ مقابلہ کیا۔ ارے سب مصائب تو ایک طرف...... پیاس ہی کو لے لیجئے۔ جہاں ساتویں سے پانی بند ہو اور عرب کی دھوپ کے ساتھ العطش کا سیلاب طوفانی ہو رہا ہو تو جو پہلے جائے اُس کی پیاس کی عمر کم...... جو زیادہ رہے۔ اُس کی پیاس کی

عمر تشنہ بسی کی طولانی...... ممکن ہے کسی ذاکر سے آپ نے سنا ہو...... مگر جہاں تک میرا مطالعہ ہے کربلا میں یہ نہیں تھا کہ عزیزوں نے آگے جانا چاہا ہو اور اصحاب نے پیروں پر سر رکھ دیئے ہوں کہ ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے جب تک ہم زندہ ہیں۔

جی نہیں کربلا کا کارنامہ میرے نزدیک تکلفات کے ماتحت نہیں انجام پا رہا تھا۔ میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں، اُس حقیقت کی روشنی میں جو عرض کر رہا ہوں کہ مولاؑ نے حکماً پابند بنایا تھا کہ جب تک اصحاب میں سے ایک بھی ہے خبردار...... کوئی عزیز میدان میں نہ جائے...... میں اپنے لفظوں میں اس کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ مولا گویا کہہ رہے تھے کہ علیؑ اکبر تمہیں کیا حق ہے کہ کوثر پہ جا کے سیراب ہو جاؤ اور میرا حبیب ابن مظاہر پیاسا رہے...... میرے اصحاب و انصار پیاسے رہیں...... ترتیب اس اصول پر قائم کی گئی ہے...... حرؑ ابھی آیا ہے تو ابھی جائے کیونکہ جب دشمن فوج کا سردار ہو کے آیا تھا تو پانی پلا دیا اور اب دوست ہو کے آیا ہے تو ایک کوزہ آب نہیں کہ مہمان کی ضیافت کر سکیں...... تو اگر پانی پلا نہیں سکتے تو پیاسا کیوں رکھیں...... لہٰذا ابھی آئے ہو تو ابھی جاؤ...... خاص الخاص اصحاب جیسے حبیبؓ ابن مظاہر وغیرہ ظہر تک رہیں اور جب تک اصحاب میں سے ایک بھی ہے تب تک عزیز کوئی نہ جائے اور عزیزوں کی باری بھی جب آئے تو دور کے عزیز پہلے چلے جائیں...... فرزندان جعفرؑ و عقیلؑ چلے جائیں پھر بھتیجے جائیں...... برابر کا بھائی اور ان میں بھی عباسؑ بعد کے لیے ہیں اور علیؑ اصغر وہ بعد کے لیے رہیں...... بس ایک جملہ میرے پورے فلسفے کو جواب تک عرض کیا اُس پر حاوی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے معنی ہیں کہ کربلا میں جس کی قوت برداشت پر بھروسہ زیادہ ہوا اُسے آخر کے لیے رکھا...... مگر بس اب دست بستہ خود مولا کی بارگاہ میں عرض کروں گا کہ مولا یہاں تک میری منطق نے ساتھ دیا یہاں تک میرا فلسفہ ساتھ دے رہا ہے اور میں نے سمجھا اور مجمع کو یہاں سمجھا لیا۔ مگر مولا اب میری منطق ہتھیار ڈالتی ہے...... اب میرا فلسفہ جواب دیتا ہے...... مولا یہ عباسؑ کے بھی بعد...... یہ علیؑ اکبر کے

بھی بعد...... یہ چھ مہینے کی جان...... یہ شہزادہ...... وہ علی اصغر...... اس کے معنی یہ ہیں...... اس کا وہ امتحان لیا گیا جو علی اکبر کا بھی نہیں ہوا...... وہ امتحان لیا گیا۔

......☆......

# مجلس ششم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جَعَلۡنٰکَ عَلٰی شَرِیۡعَۃٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡہَا

(جاثیہ:۱۸)

ترجمہ: ہم نے تم کو دین کے کھلے رستہ پر قائم کر دیا ہے تو اسی رستہ پر چلو جاؤ۔

شریعت اسلام کا ایک جزو جس کو بہت شد و مد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور کل عرض کیا جا چکا یعنی پوتے کا محروم ہونا...... بیٹے کی موت کے بعد (میراث سے) اب ایک وسیع ...... یہ تو ایک مسئلہ تھا...... اور اب ایک وسیع باب ہے عورتوں کا اس میں کوئی ایک مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ گویا سراپائے شریعت وہاں دنیا کی نگاہ میں...... مورد اعتراض ہے اور اسی لحاظ سے دنیا کے خیال میں محتاج ترمیم ہے۔ بلکہ وہ جب ایک مسئلہ نہیں ہے تو اسے محتاج ترمیم نہیں کہنا چاہیے...... محتاج تنسیخ کہنا چاہیے۔

اب اس میں سر سے پیر تک جتنا قانون ہے اسلام میں...... یہ کہتے ہیں کہ عورت کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے...... سب سے پہلے اسلام میں یہ تصور کہ مرد کو فضیلت ہے عورتوں کے مقابلے میں...... اور ایک اسلام کے زیر سایہ گویا جو محاورہ ایسا کہ عورتیں بھی ہر وقت اُس کو یاد رکھتی ہیں کہتے ہیں...... تو وہ جناب کہ عورتیں ناقص العقل ہیں تو یہ کتنی اس پورے صنف کی خودداری کے خلاف بات ہے کہ وہ جناب عورت ناقص العقل ہے۔ تو یہ گویا مرد افضل، مرد کی فضیلت اور عورت بیچاری گویا ناقص العقل...... تو یہ اسلام ہی کے زیر سایہ یہ اصطلاح قائم ہو گئی ہے لہٰذا اسلام کا یہ پورا باب...... یہ پورا صحیفہ جو خواتین سے متعلق ہے...... یہ پورا صحیفہ ہی بدلنے (نظریہ) کے قابل...... اب اُس کے تحت میں جزوی طور پر

نظریے سے تو بھی مسلمان مان رہے ہیں چاہے عملی حیثیت سے اور چاہے کوئی مسلمان اس کو عمل میں اس کے نہ لاتے ہوں۔ مگر ذہن میں ان کے بھی یہ تصور ہے کہ جناب مرد عورت میں یہ تفریق کہ مرد کو پردے کا حکم نہیں دیا گیا اور عورت کو پردے کا حکم دیا...... تو یہ کتنی بڑی زیادتی ہے عورت کے ساتھ...... یوں بھی اس رخ سے کہ توہین ہے یہ عورت کے طبقے کی کہ مرد تو کھلے بندوں پھرا کریں اور عورتیں بیچاری جو ہیں وہ بند ہو کے رہیں...... تو یہ عورت کی توہین ہے۔

قانون شہادت میں دو مرد...... ان کی گواہی معتبر ہے اور عورتیں جب تک چار نہ ہوں اُس وقت تک گواہی مکمل نہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ نظام شہادت میں وہ دو مل کے ایک ہوتی ہیں یعنی ایک ایک مرد اُس کے متوازی ہوتی ہیں دو عورتیں۔ اب اس کا دوسرا رُخ ہے کہ اسلام نے اُن کو آدھا آدمی مانا ہے پورا آدمی نہیں مانا ہے تو یہ کتنی غضب کی...... کتنے غضب کی بات ہے اور اب وہی پردے کے حکم کے ساتھ ہی، اب وہ کچھ لوازم ہیں جو اپنے ذہن سے...... اسلام میں نہیں تھا مگر یہ کہتے ہیں کہ دیکھو پردے میں رکھ کے نصف نوع انسانی کو بیکار بنا دیا کہ آدھی...... آدھا طبقہ انسان کا وہ تو کارآمد اور آدھا طبقہ نوع انسانی کا...... اور زیادہ ملکوں کی مردم شماری کے لحاظ سے کچھ آدھے سے زیادہ طبقہ کیونکہ عموماً اکثر اور زیادہ تر ملکوں میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، مردوں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نصف اصغر جو ہے وہ تو کارآمد اور نصف اکبر جو ہے وہ بے کار اور اسلام نے انہیں بیکار کر دیا۔ تو یہ چیز بھی شریعت اسلام کی سوغات ہے۔ شریعت اسلام نے یہ کر دیا ہے۔

اور غرض یہ کہ یہ ہے خواتین کے سلسلے کا تو پورا قانون۔ یہ قانون اب اُسی کے ذیل میں ہے کہ مرد کو طلاق کا حق اور عورت کو اختیار طلاق کا نہیں...... اُسی کے تحت میں ہے کہ مردوں کو چار تک شادیوں کی اجازت ہو عصر واحد میں اور بیچاری عورت کے لیے بس ایک ہی پر اکتفا...... ایک سے زیادہ کا حق نہیں...... یہاں آدھا حصہ بھی نہیں...... میراث میں اس

کو جتنا ملے اُس سے آدھا تو ہے اس کا اور یہاں تو جناب آدھا بھی نہیں۔ تو یہ تمام ہر قدم، ہر چیز میں فرق اب یہاں پر اسلام کے کچھ خیر خواہ آدمی خاص خاص باتوں میں آکر اپنے توسیع پسندانہ تصور کو اسلام کے ساتھ نبھانے کے لیے اُس کا انکار کر دیتے ہیں کہ نہیں اسلام میں یہ ہے ہی نہیں۔

مثلاً پردے کے لیے نہیں اسلام میں پردہ ہے ہی نہیں مثلاً طلاق کے حق کیلئے کہ نہیں اُس کو بھی آزادی ہے اس کو بھی حق ہے تو میں کہتا ہوں ایک ایک کو لیکر آپ تصور کو گویا اسلام کو اپنے ترقی پسندانہ جوہر کا حامل ثابت کریں۔ اُس سے کیا ہو گا؟ جبکہ پوری دنیا احکام خواتین کی جو ہے...... وہ سب آپ کے خلاف ہے تو گا ہے گا ہے میں آپ تبدیلی کیجئے (اس سے اسلام) اس سے زیادہ آسان شکل میں ایک یہ جملہ ہے کہ ہم اس شعبے میں اسلام کو نہیں مانتے ہیں...... کہ اس زحمت کے بجائے کہ ایک ایک جز کو لے کے...... اور یہ کہیے کہ نہیں۔ یہ علماء نے یہ حکم دیا ہے۔ علماء کا یہ تصور ہے، نہیں جہاں تک ہم قرآن وحدیث سمجھتے ہیں تو اسلام میں یہ نہیں ہے...... تو ایک ایک جز ہوتا تو آپ کی محنت سوارت ہوتی۔ لیکن جبکہ وہ پورا نظام قدم قدم کے اوپر اور وہ آپ کے تصور کے خلاف ہے تو زیادہ آسان شکل یہ ہے کہ آپ کہیے کہ ہم اسلام کے اس شعبے کو نہیں مانتے...... اسلام کو مان کے پھر انکار کر دینا۔ پس کہتا ہوں زیادہ بے اصول بات ہے...... ارے آپ کی سمجھ میں نہیں آتا تو آپ اس کو غیر منصفانہ کہتے ہیں' تو قانون ہی کو نہیں ماننا چاہیے۔ دین ہی کو نہیں ماننا چاہیے۔ جس میں ایسا اتنا غیر منصفانہ حکم ہو قانون ہو...... اور اگر دین کو آپ مان رہے ہیں۔ تو پھر آپ کو کچھ شکوک بھی ہوں گے تو یوں کہیے کہ نہیں۔ ابھی تک اس کا حکیمانہ پہلو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ تو اسلام کا پردہ رہ جائے گا۔ پھر ہمارا فرض ہو گا کہ ہم حتی الامکان اس کے حکیمانہ پہلو کو اگر نمایاں کر سکتے ہیں تو نمایاں کریں۔ لیکن آپ آنکھ بند کر کے اُسے غیر منصفانہ کہیں تو اس دین کو ہی آپ کیوں مان رہے ہیں؟ جس میں ایسی غیر منصفانہ بات ہے۔

تو اب...... جو میں نے عرض کیا کہ یہ کوئی ایک مسئلہ نہیں ہے یہ تو ایک پوری دنیا ہے مسائل کی جو اس طبقے سے متعلق ہے تو اس کے بعد میرے لیے بڑی دشواری ہے کہ اب یہ ایک مجلس کی بات نہ رہی، ایک پورے عشرے کی بات ہوگئی، اب وہ تو ایک عدد مسئلہ تھا پوتے کی میراث کا...... اُسے میں نے ایک مجلس میں عرض کر دیا۔ لیکن اب یہ ایک پورا بقول آپ کے آدھے سے زیادہ نوع انسانی سے متعلق مسائل، اُن کو میں ایک مجلس میں آپ کے سامنے عرض کرسکوں۔ یہ تو بڑی مشکل بات ہے۔ بہر حال کوئی بنیادی چیز اُس کی مجھے لینا چاہیے۔ تو حقیقت میں جتنے تمدنی مسائل اس شعبے سے متعلق ہوتے ہیں اُسی میں وہی کارآمد ہونا اور بیکار رہنا بھی آجاتا ہے اور اُسی میں بہت سے مسائل آجاتے ہیں۔ وہ قرآن مجید کا ایک لفظ ہے جو اس صنف کے لیے...... قرآن مجید میں جس کو منتخب کیا ہے۔ وہ سورہ نساء کی پہلی آیت ہے اور میں کہتا ہوں اسلام میں اس طبقے کی اہمیت یہ ہے کہ مردوں کے نام پہ کوئی سورہ نہیں ہوا لیکن عورتوں کے نام پر ایک پورا سورہ ہے۔ شخصیتوں کے نام پر مردوں کے ہیں...... سورہ ابراہیم...... سورہ ہودؑ...... اور سب سے بڑھ کر سورہ محمدؐ ہے۔ شخصیتوں کے نام پر ہیں تو وہ ایسا ہی ہے جیسے اس طبقے میں سے بھی ایک شخصیت کے نام پر سورہ مریمؑ ہے۔ لیکن بحیثیت صنف مجھے کوئی سورہ نہیں معلوم جس کا نام سورۃ الرجال ہو...... مردوں کا سورہ...... کوئی سورہ۔

میں سمجھتا ہوں کہ وہ کسی دور کے بنائے ہوئے وہ پٹنے کے باقی پور کی لائبریری میں جو ایک غلط قرآن ہے جسے ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ کسی دشمن اسلام کا مرتب کیا ہوا ہے۔ جو ہمارا بھی دشمن تھا۔ مرتب کرنا دشمن اسلام سے تھا اور ہماری طرف منسوب کرنا ہماری دشمنی سے تھا اور شاید وہ دشمن اسلام سمجھتا تھا کہ حقیقی اسلام یہی ہے...... اس لیے اس نے اپنے تیر کا شکار ضمناً ہمیں بھی بنالیا...... تو وہ غلط جو ہے اس میں بھی جہاں تک سنا ہے میں نے اس قرآن کو نہیں دیکھا...... لیکن اس میں بھی کوئی سورہ الرجال نہیں ہے...... تو جناب

عورتوں کے نام پر ایک مستقل سورہ اور وہ بھی مختصر سوروں میں نہیں...... یعنی طولانی سورہ میں سے ہے۔ بات یہ ہے کہ جدھر افراط و تفریط کے تصورات کی تاریکی زیادہ ہو اُسی طرف روشنی زیادہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ہر ایک شخص دیکھ سکتا ہے جو عربی دان نہ ہو وہ بھی ترجموں کی مدد سے اس کو سمجھ سکتا ہے جو میں عرض کر رہا ہوں کہ اس سورۂ میں بکثرت احکام شرعیہ ہیں۔ جو اس طبقے سے متعلق ہے اور اب پورے قرآن کو دیکھ ڈالیے جہاں احکام شرعیہ بتائے گئے ہیں وہاں ہمیشہ مخاطب...... کو کہا ہے۔

نماز کا حکم ہوا...... نماز اہل ایمان کے لیے کھلی راہ ہے جو بہ اعتبار واقعات۔ روزے کا حکم ہو...... اے صاحبان ایمان تم پر روزہ فرض ہے بلکہ مطلق اطاعت خدا اور رسولؐ کا حکم ہوا...... اے صاحبان ایمان تم اطاعت کرو۔ اللہ اور رسولؐ کی یہ ہی مقتضائے بلاغت قرآنی ہے اس لیے کہ جس نے آپؐ کے پیغام ہی کو نہیں مانا۔ جس نے رسولؐ کو رسولؐ ہی نہ سمجھا اس کو پکار کے کہا جائے گا کہ نماز پڑھو...... روزہ رکھو...... اطاعت کرو...... اس کو مخاطب کر کے حکم اطاعت دینا خلاف بلاغت ہے...... لہٰذا ان احکام میں ہمیشہ صاحبانِ ایمان کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اے ایمان لانے والو اطاعت کرو۔ اے ایمان لانے والو...... نماز پڑھو...... اے ایمان لانے والو...... روزہ رکھو...... کیا مطلب ہوا...... مطلب یہ ہے کہ ایمان لائے ہو تو ہم سے سنو اور پھر اطاعت کرنا...... ایمان لائے ہو تو پھر روزہ بھی رکھو...... اب یہ انقلاب زمانہ ہے کہ آجکل ہم مومنین ہو کے بچنا چاہیں یعنی چونکہ مومن ہیں۔ لہٰذا نماز کی کیا ضرورت ہے چونکہ مومن ہیں لہٰذا روزے کی کیا ضرورت ہے چونکہ مومن ہیں لہٰذا اطاعت کی کیا ضرورت ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اطاعت کریں کافر اور نماز پڑھیں منافق...... ہم چونکہ بحمد اللہ مومن ہیں۔ لہٰذا ہمیں نہ اطاعت کی ضرورت...... نہ روزے کی ضرورت...... نہ نماز کی ضرورت۔ یعنی یہی کیا کم احسان ہے کہ ہم ایمان لائے ہوئے ہیں اور پھر ایمان لا کے پھر اطاعت بھی کریں۔ تو خیر یہ تو ہماری منطق الٹی ہوگئی ہے۔ لیکن قرآن مجید میں ہر جگہ پکارا

گیا ہے اہل ایمان کو۔ مگر بس یہ سورہ جس میں احکام شرعیہ موجود ہیں۔ اس کا سرنامہ یا ایھا الذین امنو نہیں ہے۔ بلکہ یا ایھا الناس ہے۔ پہلی آیت جو ہے سورہ النساء کی اس میں کہا جا رہا ہے...... اے انسانوں...... اے صاحبان ایمان نہیں...... اے انسانوں اللہ کو یاد رکھو...... اللہ کی عظمت کے تقاضوں کو محسوس کرو...... جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور تمہارے پہلے والوں کو بھی...... یہیں سے ذکر النساء شروع ہوتا ہے۔

اس نے تم سب کو ایک تنفس سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اُس کے شریک حیات کو قرار دیا ہے خلق فرمایا ہے۔ یعنی آغاز ہی ہے ذکر النساء شروع ہو گیا ہے اور اس کا سرنامہ یا ایھا الذین امنو نہیں قرار دیا ہے یا ایھا الناس قرار دیا ہے کیوں؟...... اس پر انتباہ ہے کہ جن خرابیوں کی اصلاح مدنظر ہے وہ کسی ایک قوم و مذہب میں نہیں پائی جا رہی ہیں۔ وہ ایک جماعت میں نہیں پائی جا رہی ہیں بلکہ تمام نوع انسانی میں وہ خرابیاں وہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا اس کے لیے ہم کو جو روشنی ڈالنا ہے وہ سبھی کی آنکھوں کو کھولنے کے لیے ہے۔ یہ اور بات کہ اپنوں کیلئے اُس کی حیثیت حاکمانہ فرمان کی ہوگی۔ دنیا کے لیے حکیمانہ نصیحت کی ہوگی۔

تو اب اسی آیت میں اس طبقے کا ذکر شروع کیا گیا ہے وہ دیکھنا ہے۔ وہ یہ نہیں کہا گیا ہے کہ عورت...... ہے نساء کا (ذکر) سورہ لیکن جس سے آغاز کیا گیا ہے جس لفظ سے تعارف اس فریق کا کرایا گیا ہے وہ کیا ہے؟...... ایک تنفس سے پیدا کیا اور اسی تنفس سے جس کو میں نے ترجمہ کیا کہ رفیقہ حیات اور شریک زندگی اور یہ سب میری لفظیں ہیں۔ جو گویا جدید ادب سے مجھے ملی ہیں اور ترقی پسندانہ ادب کی دین ہیں۔ ورنہ قرآن مجید میں نہ وہاں شریک حیات ہے۔ نہ وہاں رفیق زندگی ہے وہاں جو لفظ استعمال کی گیا وہ یہ کہ اس سے اُس کے زوج کو خلق فرمایا۔ جہاں تک میں غور کرتا ہوں۔ جتنے بھی تمدنی مسائل ہیں اس طبقے کے متعلق۔ وہ سب اس لفظ زوج سے وہ تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ یعنی صنف رجال کیلئے

صنف نساء یہ جو رشتہ ان میں قائم ہوتا ہے ابتدائی کہ اسی رشتے کے قیام سے اور رشتے دار پیدا ہو جاتے ہیں۔

تو ابتدائی رشتہ جو آپ کی زبان میں اُدھر تو صنف لطیف کہتے ہیں۔ اب آجکل کے ادیب مجھے بتائیں۔ دوسری صنف کو میں کیا کہوں صنف لطیف بھی میری ایجاد نہیں ہے۔ وہ ماشاءاللہ ترقی یافتہ ادب کی ہے۔ تو اب میں...... اس کے مقابل میں آپ بتائیے دوسری صنف کو کیا کہوں اب جو آپ تجویز کریں وہ مجھے نہیں آتی ہے تو اب وہ...... اب میں احتیاط کے ساتھ۔ بہرحال کچھ کہنا ہے۔ تو میں کہوں گا...... صنف لطیف اور صنف غیر لطیف اور وہ ہم سب بحمداللہ صنف غیر لطیف میں داخل ہیں اور جو پردے کے ادھر ہونگے افراد...... وہ سب صنف لطیف میں داخل ہیں اور اب یہ صنف لطیف کے لیے قرآن مجید نے جو لفظ صرف کی ہے وہ زوج اب یہ زوج کیا ہے۔ ہماری یعنی ماشاءاللہ مجمع میں عربی دان افراد اور صاحبان علم بھی موجود ہیں اور کسی نہ کسی درجے کے عربی دان بہت سے ہونگے جن میں سے بعض سے واقف نہ ہوں گا۔ تو ہم عربی آمیز اُردو میں یہ فرق کرتے ہیں کہ ایک کو زوج کہتے ہیں۔ ایک کو زوجہ۔ یعنی شوہر کو کہیں گے زوج اور بیوی کو کہیں گے زوجہ...... مگر میں جتنی عربی جانتا ہوں اس کے لحاظ سے میں کہتا ہوں کہ ادب اور عربی کے لحاظ سے یہ فرق نہیں ہے یعنی زبان کے ساتھ جو فرق پیدا کیا ہے کہ یہ ہے زوج اور وہ ہے زوجہ بلکہ جو ادھر سے رشتہ ہے وہی اُدھر سے رشتہ ہے۔ یہ نسبی رشتوں میں بس ایک رشتہ ہے کہ جو ادھر سے ہے وہی اُدھر سے ہے۔ وہ کون جناب۔ بھائی کا رشتہ ہے سب رشتے اُدھر سے اور ادھر سے اور اُس کو پھیلا کے اس وقت نہیں کہتا ہوں۔ بس ایک بھائی کا رشتہ ہے وہ کون بھائی۔ وہ اس کا کون بھائی لغت میں کوئی دوسرا نام اس رشتے کا نہیں ہے یہ اُس کا بھائی وہ اس کا بھائی ہر رشتے میں فرق ہوگا۔ اب ایک راز سمجھ میں آتا ہے کیونکہ بڑا مسئلہ تہذیب قرآنی کا ہے کہ اُس نے کہا...... مومنین سب بھائی بھائی ہیں۔

حالانکہ ہمارے لحاظ سے محبت کے جذبوں کو بیدار کرنے کے لیے یہ ہے کہ جو بڑے ہوں انہیں باپ سمجھو جو چھوٹے ہیں انہیں بیٹا سمجھو جو برابر والے ہیں خیر عمر میں۔ انہیں بھائی سمجھ لو۔ لیکن قرآن اِنَّمَا کلمہ حصر کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ مومنین بس بھائی بھائی ہیں کچھ اور نہیں ہیں جو باپ بیٹے ہیں وہ بھی بحیثیت مومن کے بھائی بھائی ہیں۔ جو دادا پوتے ہیں وہ بھی بحیثیت مومن کے بھائی بھائی ہیں یعنی دنیائے دین میں اور کوئی رشتہ نہیں ہے آپس میں سوا بھائی کے ستر برس کا بوڑھا اور پندرہ برس کا ہماری زبان میں بچہ، جو ابتدائی بلوغ کی منزل ہے۔ وہ دونوں بس بھائی بھائی ہیں۔ یہ اُس کا بھائی وہ اُس کا بھائی آخر یہ سب رشتے کیوں قرآن نے چھوڑ دیئے۔ یہ بھائی بھائی کا رشتہ کیوں لیا...... جتنے رشتے ہیں وہ ادھر سے رشتے اور اور اُدھر سے رشتے اور...... وہ باپ ہے تو وہ بیٹا ہے...... وہ چچا ہے تو وہ بھتیجا ہے...... وہ دادا ہے تو وہ پوتا ہے جب رشتے الگ الگ ہو جائیں تو فرائض اور حقوق الگ الگ ہو جائیں گے۔ لیکن یہ رشتہ بھائی کا وہ ہے کہ جو ادھر سے رشتہ وہی اُدھر سے رشتہ ایک ہی رشتہ ہے دونوں طرف سے تو جو حقوق اس کے ماننا پڑیں گے...... وہ حقوق اُس کے ماننا پڑیں گے...... جو فرائض اس کے ماننا پڑیں گے...... وہ فرائض اس کے ماننا پڑیں گے...... بٹوارہ حقوق و فرائض کا نہیں ہو سکتا کہ ایک طرف حقوق ہی حقوق رہ جائیں اور ایک طرف فرائض ہی فرائض ہو جائیں۔ تو یہ بھائی کا رشتہ اشتراک حقوق کا رمز ہے اب سمجھ میں آتا ہے رسولؐ نے ہر ایک کا بھائی کسی کو بنا دیا۔ لیکن اپنا بھائی بس ایک کو بنایا۔ یہ بھائی بنانا نہ تھا یہ اعلان تھا کہ جو میرے حقوق ہیں وہ اسکے حقوق ہیں۔

تو دنیائے نسب میں ایک رشتہ اور دنیائے سبب میں یہ زوج زوجیت کا رشتہ وہ فرق جو ہے عربی آمیز اردو میں زوج اور زوجہ کا وہ بھی قرآن کے رُو سے صحیح نہیں ہے۔ یعنی یہ اُس کا زوج اور وہ اس کی زوج۔ بس آپ ضمیر تذکیر و تانیث کا فرق لے سکتے ہیں اور باقی لفظ زوج دونوں میں مشترک اور اُس کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہے کہ آپ امہات المومنین کو...... وہ

طبقہ معزز...... جو تمام مومنین کے لیے ماؤں کا درجہ رکھتا ہے، اُن کے لیے کیا کہتے ہیں ازواجِ رسولؐ یا زوجاتِ رسولؐ۔ گویا غیر عربی دان بھی ازواج رسولؐ کہتا ہے۔ اگر زوجہ کی جمع ہوتی تو زوجاتِ رسولؐ ہوتیں، ازواجِ رسولؐ یہ زوج کی جمع ہے تو زوج کے معنی نہ شوہر کے ہیں نہ زوجہ کے ہیں زوجہ کے جو معنی ہیں۔ وہ عرض کروں۔ اسی سے میں کہتا ہوں جتنے تمدنی اور تہذیبی سوالات پوچھتے ہیں اس طبقے کے وہ سب اس لفظ زوج میں مضمر ہیں۔ زوج نہ اس کے معنی مرد ہیں نہ اس کے معنی عورت۔ زوج کے معنی میں نہ شوہر ہے نہ زوجہ۔ زوج کے معنی ہیں جڑواں۔ ہر دو ایک عدد زوج نہیں ہوتے۔ زوج کون ہوتے ہیں اُس کی تعریف میں کروں۔ زوج وہ دو ہوتے ہیں۔ جو ایک مقصد کی تکمیل میں دونوں ضروری ہیں۔ جن دو سے ایک مقصد کی تکمیل ہو وہ زوج ہوتے ہیں۔ یہ منبر اور یہ لاؤڈ سپیکر دو عدد تو ہو گئے مگر یہ دو ایک زوج تو نہیں ہے۔ یہ تخت اور یہ میز ملا کے دو عدد تو ہو گئے۔ ایک آدمی اور دیوار ملا کے دو عدد تو ہو گئے۔ مگر دو عدد ہوئے ایک زوج نہیں ہیں۔ تو زوج کون ہیں۔ جیسے جسم کی دو آنکھیں۔ انسان کے دو ہاتھ۔ دروازے کے دو پٹ۔ شعر کے دو مصرعے اور جدید دنیا کی مثالیں لیجئے۔ تو بجلی کے دو تار...... یہ دو۔ وہ جن سے ایک مقصد حاصل ہو۔ وہ ہوتے ہیں زوج۔

اب اسی میں میں نے کہا کہ تمام تمدنی مسائل ہیں۔ زوج بالکل ایک دوسرے کے برابر ہوتے ہیں ضرورت میں۔ یعنی کسی ایک کو حق نہیں کہ وہ دوسرے کو غیر اہم قرار دے۔ یہ اگر ضروری ہے۔ تو وہ بھی ضروری لہٰذا اہمیت میں دونوں برابر مگر صفات میں دونوں یکساں ہوں؟ اگر دونوں پٹ ایک ساخت کے ہوں تو دو پٹ ہو جائیں گے۔ ایک دروازہ نہیں ہو گا۔ ایک غزل کا مصرعہ اور ایک سلام کا۔ دو مصرعے تو ہو گئے مگر ایک شعر نہیں ہو گا۔ اگر ایک شعر ہے تو دو مصرعے وہ ہونا چاہئیں جس میں ہر مصرعے کے خلا کو دوسرا مصرعہ پورا کرتا ہو۔ تب وہ ایک شعر بنے گا ورنہ شاعروں کی زبان میں دولخت شعر ہو گا۔ ایک مصرعہ کہیں جا رہا

ہے کوئی مضمون ہے اُس کا اور دوسرا مصرعہ کہیں جا رہا ہے کوئی مضمون ہے تو ہر مصرعے میں دوسرے کی رعایت ہونا چاہیے یعنی ہر مصرعہ کسی حد تک محتاج ہو دوسرے کا۔ تب وہ دو مصرعے مربط ہوں گے اور اب جدید مثال جو میں نے دی وہیں آجاؤں مطابقت میں وقت ضائع کرنا نہیں ہے وقت کم ہے۔ ایک مجلس میں بہر حال مجھے اس جز کو مکمل کرنا ہے۔ تو وہ جناب والا وہ دو تار کی مثال میں نے اسی لیے دی۔ اگر دونوں مثبت ہوں تو نتیجہ یعنی بجلی پیدا ہوگی؟ اور اگر دونوں منفی ہوں تو کیا پھر بجلی پیدا ہوگی۔ وہ دو تار جن میں ایک مثبت ہو اور ایک منفی ہو۔ اس سے بجلی ہوگی تو اگر مرد اور عورت زوج ہیں تو مرد کو مرد رہنا چاہیے۔ عورت کو عورت رہنا چاہیے اسی معیار ترقی وتمدن ان دونوں کا بدل گیا۔

حضور والا۔ مرد کا یہ جوہر نہیں ہے کہ اُس میں زنانہ پن پیدا ہو جائے اور عورت کا بھی پھر یہ کمال نہیں ہے کہ اُس میں مردانہ پن پیدا ہو جائے۔ بس اب اس پورے نظام کے ماتحت احکام اسلام کو جانچیے اسلام عورتوں کی ترقی کا مخالف نہیں ہے۔ مگر معیار ترقی دیکھئے کیا ہو۔ مرد مرد ہوتے ہوئے ترقی کرے یعنی صفات مردانہ میں ترقی کرے۔ عورت عورت ہوتے ہوئے ترقی کرے یعنی صفات زنانہ میں ترقی کرے۔ آپ کہتے ہیں کہ مرد عورت برابری ہونا چاہیے برابر ہونا چاہیے۔ ہر میدان میں دوش بدوش، ہر میدانِ عمل میں دوش بدوش کارخانوں میں دوش بدوش دفتروں میں ورش بدوش، ہر میدان میں دوش بدوش......

مبارک ہو یہ ترقی مگر اب میں کیا کروں کہ اسلام میں تو نماز تک میں دوش بدوش نہیں......

حالانکہ نماز تو ایک سماجی چیز ہے مابین خود اور خدا ہے اس کا فکر نما. میں بھی۔

ترکیب نماز دونوں کے لیے الگ الگ، کتنی ہی ترقی پسند خاتون ہوں لیکن اگر نماز پڑھنا ہے تو اُسے پھر ان احکام کی پابندی کرنی ہے۔ مردوں کے لیے کچھ نمازیں جہت کے ساتھ۔ کچھ اخوات کے ساتھ اور خواتین کے لیے سب نمازیں اخوات کے ساتھ...... افعال نماز سب نام کو ایک ہیں۔ رکوع اُن کے ہاں بھی، ان کے ہاں بھی، سجدہ ان کے ہاں، اُن

کے ہاں بھی، سب وہی۔ لیکن وہ تو پرانے زمانے کی دینیات کی کتاب جناب مولوی فرمان صاحب کی لکھی ہوئی کسی کے پاس ہو...... وہ دیکھ لے کہ اس کی پشت پر نقشے کی صورت میں مرد اور عورت کی نماز کا فرق لکھا ہوا تھا۔ تو اس میں سب واجب فرق نہیں ہیں...... کچھ واجب ہیں...... کچھ مستحب ہیں...... لیکن جو مستحب ہیں وہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نظر میں مثالی (کردار) تو ہیں...... وہی ہے جنہیں مستحب قرار دیا گیا...... تو جناب اب میں مجملاً کہہ رہا ہوں سب نتائج تھوڑی بیان کرنا ہے یہ ڈر ہے سب کہیں کے کہ تحفۃ العوام پڑھ رہے ہیں۔

جسے ذوق جستجو ہو اور اتفاق سے نہ معلوم ہو وہ پوچھے علماء کا ہے کے لیے ہیں۔ آپ کے ہاں بھی بحمد اللہ علماء موجود ہیں مگر آجکل تو علماء کا مصرف تو بس استخارے دکھلوانا ہے اور کوئی مصرف علماء کا رہا نہیں یا عقد پڑھوانا اور باقی مسائل کی بحمد اللہ ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ لہٰذا عالم صاحب سے شاید مہینہ مہینہ بعد اتفاق ہوتا ہو کہ کوئی مسئلہ پوچھیں۔ سب بحمد اللہ عالم ہو گئے ہیں۔ یا یہ کہ بے نیاز ہو گئے ہیں...... تو مسائل کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ تو اس کی وجہ سے ممکن ہے کہ یعنی خدانخواستہ میں کسی ایک کو تو نہیں جانتا کہ یہاں ایسا ہے یاد رکھئے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے جب لوگ مسئلے پوچھیں گے نہیں۔ تو علماء مسئلے بھول جائیں گے نتیجہ یہ ہوگا کہ پوچھے گا بھی تو نہیں بتاسکیں گے تو اُن کے بھول کی ذمہ داری آپ پر ہے کہ آپ نے مشق کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ آپ نے اس علم کو سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ تو سال بھر میں دو ایک مسئلے ہی کوئی پوچھتا ہے تو اس کے لیے ہم پڑھتے رہیں الغرض یہ تو غیر متعلق بات ہے۔ گویا اتنی دیر میں یہ بھول گیا تھا کہ وقت کم ہے۔

اب اسلام کا بس مقصد یہ ہے...... آپ کہتے ہیں ہر میدان میں دوش بدوش، یہاں نماز تک میں بھی دوش بدوش نہیں۔ تو وہ نقشہ میں نے بتایا تھا اُس میں کوئی دیکھ سکتا ہے کہ ان مسائل تو بیان کرنا نہیں ہے مگر ذوق جستجو تو کوئی طلب گار رہو تو اسے پیدا ہونا چاہیے تو جس

وقت سے نماز شروع ہوئی اُس وقت سے میں نے کہا کہ کچھ واجب فرق ہے اور کچھ مستحب وہ بھی پوچھنے سے متعلق ہیں کہ کون واجب کون مستحب کہ جناب جونہی کھڑے ہوئے نماز کے لیے تو دونوں پیروں کا فاصلہ الگ الگ۔ مرد کیلئے فاصلہ اور عورت کیلئے اور جناب ہاتھوں کے رکھنے کی ساخت الگ الگ فقہ اہل بیت کے لحاظ سے عرض کر رہا ہوں۔ قیام کی حالت میں ہاتھوں کے رکھنے کا انداز الگ الگ۔ اب اُس کے بعد کیا ہوگا۔ رکوع ہوگا نا۔ رکوع میں جھکنے کا پیمانہ الگ الگ اور اس کے بعد قیام ہوا۔ تو قیام کے بعد سجدہ کرے گا نا یا کرے گی نا۔ تو وہ مجھے وہ ضمیر میں نہیں معلوم جو دونوں کے لیے مترادف ہو۔ اس میں ادب میں بھی مساوات نہیں معلوم ہوتی۔

تو جناب وہ رکوع جو ہوگا۔ تو رکوع دونوں کو کرنا ہے میں نے کہا جھکنے کا پیمانہ الگ الگ اور اس کے بعد اب سجدہ کرنا ہے تو سجدے میں جاتے وقت کا انداز الگ الگ...... اور پھر جب سجدہ کیا تو اجزائے جسم کے زمین پر رکھنے کی ساخت الگ الگ اور اس کے بعد سر اٹھایا اور نشست ہوئی...... تو بیٹھنے کا طریقہ دونوں کے ہاں الگ الگ اور اس کے بعد اب پھر سجدہ کیا اور پھر سجدہ میں اعضاء کی ساخت الگ الگ اور پھر اُٹھے اور کھڑے ہونے کی منزل آئی، دوسری رکعت کے لیے تو کھڑے ہونے کا طریقہ دونوں کا الگ الگ۔ تو ہر ہر قدم پر فرق۔

میں کہتا ہوں کہ نماز کو خاصیت ہے۔ خاصیت تو نہیں ہے یعنی جو ہر کمال ہے "رجوع" رجوع قلب...... یعنی محویت...... محویت ایک معنی رجوع قلب کے۔ وہ محویت کی منزل ہم نے سنی ہے کہ تیر پیروں سے کھینچ لیا گیا اور ایک مثالی نماز والے کی نماز میں...... اس کو خبر نہیں ہوئی تو یہ محویت ہے۔ جو ہر کمال لیکن ہر صاحب فہم ذرا سی بھی سمجھ والا غور کرے کہ اگر محویت میں مرد بھول گیا۔ اپنے مرد ہونے کو اور عورت بھول گئی اپنے عورت ہونے کو...... تو کیا ان احکام پر عمل ہو سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی نظر میں جتنی اہمیت رجوع

قلب کی ہے اتنی ہی اہمیت اس کے نزدیک اپنے خصوصیت صنفی کے یادرکھنے کی ہے کہ مرد کو ہر قدم پر احساس رہنا چاہیے کہ ہم مرد ہیں۔ تو نماز میں یاد رہے اور عام زندگی کے نظام میں بھول جائے۔ مرد کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم مرد ہیں اور عورت کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم عورت ہیں اور یہ فرق تو اصل نماز میں ہے تو جناب لباس نماز مرد کیلئے وہ لباس جو صحت نماز کے لیے ضروری ہے، بہت مختصرہ لیکن عورت کے لیے کتنی ہی ترقی پسند عورت ہو لیکن اگر نماز پڑھتا ہے تو سوائے چہرے اور دونوں ہاتھوں کے...... اور بعض علماء کے نزدیک قدم کے پنجے اور باقی کوئی بھی حصہ جسم اگر کھلا ہوا۔ تو نماز باطل ہوگی...... اب یہ چیز جو عام لوگوں کے ذہن میں نہ ہو۔ وہ عرض کروں کہ یہ جو حکم آیا ہے، نامحرم کی خاطر نہیں ہے۔ اگر پردہ شب میں، تنہائی میں گھر کے دروازے بند کر کے، پردے ڈال کر بھی ہو اور اس سے زیادہ کوئی جز و کھلا رہے تو نماز باطل ہوگی۔ میں کہتا ہوں۔ اس سے خالق کریم کے مرضی کے معیار کو دیکھئے کہ وہ اللہ جو اپنی بارگاہ میں عورت کو بے پردہ دیکھنا نہ چاہے۔ وہ اس پر راضی ہوگا کہ بوالہوس مردوں کے سامنے عورت کھلے بندوں ماری ماری پھرا کرے۔ تو عدل یہی ہے۔

اب عورتوں کو سکھا دیا کہ دیکھو خدا نے عورت کی اتنی بڑی توہین کی کہ مرد کو پردے میں نہیں رکھا اور عورت کو پردے میں رکھا۔ میں کہتا ہوں کہ ابھی تک تو ہمارا تصور یہ ہے کہ پردہ علامت احترام ہے۔ اُس دن کہہ چکا کہ ہر گھر میں ہمارے عزا خانہ ہے۔ جتنے حصے ہوتے ہیں (گھر کے) وہ سب بے نقاب لیکن جو عزا خانہ ہوتا ہے اس پر پوشش رہتی ہے۔ بہت سی کتابیں ہیں کسی پر غلاف نہیں۔ لیکن قرآن مجید...... اس پر غلاف۔ تو اب بے پردگی معیار احترام ہے یا پردہ اور اب دنیا میں تاریخ ارتقا کی کوئی دیکھ لے کہ عورتوں کے پردے پر احتجاج جس ملک میں بھی شروع ہوا ہے۔ ترقی یافتہ مردوں کی طرف سے شروع ہوا ہے۔ عورتوں کی طرف سے وہ خود نہیں شروع ہوا ہے چاہے مصر میں ہو چاہے عراق میں ہو چاہے کسی بھی ملک میں ہو۔ پہلے ترقی پسندوں نے 'ترقی یافتہ مردوں نے' ترقی پسند مردوں نے

احتجاج شروع کیا ہے تو مثال تو بڑی سخت ہے مگر چونکہ کہنے والا اسی طبقے سے متعلق ہے جس کے خلاف مثال ہے کہ عورتوں پر مردوں کا احتجاج کرنا۔ عورتوں کے پردے پر مردوں کا کتابیں لکھنا یہ تو ایسا ہے جیسے دنیا کے چور ڈاکو سب کانفرنس کریں اور احتجاج کریں کہ یہ راتوں کو گھر کے دروازے کیوں بند ہوتے ہیں۔

صاحب...... آزادی کا دور ہے۔ دونوں ملک آزاد ہیں' اُدھر بھی آزادی۔ ادھر بھی آزادی۔ تو آزاد ہونے کے بعد یہ کون پابندی ہے کہ نیند بے چین ہو رہی ہے اور دل چاہتا ہے کہ سو جائیں لیکن پھر بھی جائیں اور دروازہ بند کریں۔ ارے صاحب آزادی کا زمانہ ہے یہ کون مصیبت ہے کہ روز جا کے دروازے بند کریں...... اور احتجاج فرما رہے ہیں۔ وہی چور ڈاکو۔ جن کے خوف سے بند ہو رہے ہیں۔ تو بس عورتوں کے پردے پر مردوں کا احتجاج۔ اس کی حیثیت یہی ہے۔ اب کیا توہین؟ میں کہتا ہوں کہ توہین ہے تو مردوں کی ہے۔ عورتوں کی نہیں ہے۔

ایک مخصوص کاغذات کا صندوقچہ کھلا ہوا ہو۔ آپ مطالعہ کر رہے ہیں۔ ایک قابل اطمینان آیا۔ صندوقچہ کھلا رہا۔ آپ کاغذات دیکھتے رہے' کوئی مشکوک آدمی آیا۔ فوراً کاغذات بند صندوقچہ مقفل...... توہین کس کی ہوئی کاغذات کی یا اس آدمی کی۔ اس کے معنی یہ ہیں۔ جس کا پردہ ہو اس کی توہین نہیں ہوتی۔ جس سے پردہ ہو' اس کی توہین ہوتی ہے اور اسی لیے مردان روزگار کو ناگوار ہے اور اب ایک جملہ ہے جو نفسیاتی حقیقت رکھتا ہے اُسے فرصت کے لمحات میں غور کر لیجیے کہ یہ عورت کی فطرت پر شارع اسلام اور خالق انسان کا اعتماد تھا کہ آغاز تحریک خیانت اس کی طرف سے نہیں ہوتی۔ اس لیے مردوں کو پردے میں نہیں رکھا اور یہ مردوں پر بے اعتمادی تھی۔ تو عورتوں کو پردے کا حکم ہوا اور اب جو اصول ایک ہوتا ہے۔ اس کے تقاضے ایک ہوتے ہیں۔ اگر پردہ بہ نظر توہین ہوتا۔ تو دینی حیثیت سے جن عورتوں کی عزت کرانا تھی۔ اُن میں پردے کے حکم کی کمی ہوتی۔

مگر بلا تفریق فرقہ، سب کے نزدیک ازواج رسولؐ کو بحیثیت رشتہ رسولؐ کے ایک خاص احترام اور عزت کا درجہ ملنا تھا۔ اب کوئی اپنے عمل سے باقی نہ رکھے وہ اور بات ہے۔ مگر خاص درجہ دینا تھا خالق کو۔ عزت و احترام...... اور اسی لیے کہہ دیا گیا کہ تمہاری مائیں ہیں اور ماشاءاللہ صاحبان فہم ہیں۔ میں کہتا ہوں ماں کہنے کے بعد اگر پردے کے حکم میں کمی بھی ہوتی۔ تو توہین نہ بنتی کیونکہ جب ماں ہو گئیں تو پھر پردہ کیسا۔ مگر اس حکم کی اتنی اہمیت تھی کہ ماں کہہ دیا گیا۔ مگر پھر بھی پردے کے حکم میں بجائے کمی کے اضافہ کر دیا یعنی عام حکم پردہ میں تو برقعہ و چادر کے اندر...... باہر نکلنا...... وہ صحیح ہے عراق و ایران میں ہمیشہ خواتین باپردہ گھر سے باہر آتی رہیں۔ وہ ضروریات کے لیے۔ حرم میں زیارت کے لیے بلکہ کوئی ضرورت ہو تو اُس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے۔ لیکن ازواج رسولؐ ان کو حکم ہوا چار دیواری کے پردے کا...... اپنے گھر میں بیٹھو۔ یعنی برقعہ و چادر میں نہاں ہو کر بھی تمہیں نکلنے کا حق نہیں ہے اور اسی لیے جناب سودا بھی ام المومنین تھیں۔ انہوں نے بعد رسولؐ حج بھی نہیں کیا۔ کسی نے کہا تھا آپ حج کو نہیں جاتیں؟ کہا زمانہ رسولؐ میں میں حج کر چکی ہوں۔ لیکن یہ کہ اب تو مجھے حکم گھر میں بیٹھنے کا ہے۔ اب یہ آپس میں کچھ ذہن کا فرق ہو سکتا ہے۔ کوئی کس حد تک اُس کی حدود سمجھے اور کوئی کس حد تک سمجھے۔ بہر حال انہوں نے یہ عمل کر کے دکھا دیا اور اُمّ المومنینؑ نے گویا اپنے سیاسی مفاد کو نہ حاصل کیا' اس حکم کے احترام میں کہ جناب ام سلمیٰؓ نے عرض کیا یا امیر المومنینؑ ...... بڑی باوفا اور اطاعت گزار اور حق شناس بیوی تھیں۔ تو جناب ام سلمیٰؓ نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ تو پھر سیاسی طور پر دیکھیے کہ پلڑا برابر ہو جاتا۔ مگر امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا...... کہ کسی اور نے رسولؐ کے ساتھ رشتے کا وقار نہ رکھا تو میں بھی نہ رکھوں۔

آخر میں جو چیز کل میں نے پوتے کی میراث میں عرض کی وہ غیر مسلم کی میں بات کر رہا ہوں۔ جو اسے قانونِ رسولؐ سمجھتا ہو۔ رسولؐ ویسے وہ نام لے کے کہتے۔ محمدؐ صاحب کا

قانون سمجھتا ہو یا عیسائی کی زبان میں کہہ دوں...... تو نبی کا قانون مانتا ہو۔ اُس سے میں کہوں گا کہ قانون اسلام کا یہ باب جسے آپ ناانصافی قرار دے رہے ہیں۔ پورا باب...... یہ اگر ایسے ذریعے سے پہنچا ہوتا۔ جن کو خدا نے بیٹا عنایت کیا ہے۔ تو آپ کہتے کہ اُسے قدر بیٹی کی کہاں ہے مگر وہ قانون پہنچا ہے ایسے کے ہاتھ سے جس کو اللہ نے بیٹی ہی عنایت کی ہے۔ ارے بیٹے تو پھر اُسی بیٹی کے ذریعے سے مل گئے۔ ورنہ براہ راست رسولؐ کے لیے کوئی بیٹا...... وہ پیدا ہوئے تھے۔ جناب خدیجہؑ کبریٰ سے اور پھر جناب ماریہ قبطیہؓ سے جناب قاسم ہوئے۔ لیکن یہ کہ بمشیت پروردگار جب وہ دو، ایک برس کے تھے۔ واپس لے لئے گئے۔ جو رہی اولادِ رسولؐ کی۔ وہ بیٹی ہے۔ تو...... جس کے پس بیٹی ہے اولاد اور وہ یہ قانون دنیا تک پہنچا رہا ہے۔ اب آپ کیا کہیں گے کہ اس میں عورت کے حقوق سے بے خبری ہو سکتی ہے؟

یہ وہ چیز ہے جس پر غور کرنے میں مذہب وملت کا سوال نہیں ہے میں کہتا ہوں۔ اللہ نے اُسے بیٹی ہی عنایت کی ہے اور بیٹی ایسی ہے کہ دُنیا میں کوئی باپ بیٹی کی تعظیم کو نہیں کھڑا ہوگا۔ مگر وہ اس بیٹی کی تعظیم کو کھڑا ہو رہا ہے۔ اب وہ یہ لڑکے اور لڑکی کے قانون کو پیش کر رہا ہے۔ مرد و عورت کے حقوق کو وہ مقرر کر کے، بقول آپ کے مقرر کر کے، میرے نزدیک اُن قوانین کو پہنچا رہا ہے دنیا تک...... اب کسی کو اس تصور کا کیا حق ہے کہ اس میں لڑکیوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اگر لڑکیوں کے ساتھ کچھ زیادہ خصوصیت برت دی گئی ہوتی۔ تو آپ کہہ سکتے تھے لیکن وہ یہ حدود شوہر اور زوجہ کے، یہ حقوق وفرائض قرار دے رہا ہے، بتا رہا ہے۔ تو اب آپ کو تصور ہی نہیں کرنا چاہیے انسانی طور پر...... ہاں، جو کر رہا ہے وہ یہ کہ تعظیم کو کھڑا ہو رہا ہے۔ مگر تعظیم کو کھڑا ہو رہا ہے تو میں سچ کہتا ہوں۔ بیٹی ہونے کی وجہ سے نہیں...... یہ بھی ایک وسیع باب ہے مختصر الفاظ میں کہوں کہ اگر بیٹی ہونے کی وجہ سے ہوتا...... تو مجھے بھی سنت ہوتا اپنی بیٹی کی تعظیم کو کھڑا ہونا...... آپ کو بھی سنت ہوتا...... ہر مسلمان کے لیے اتباعِ رسولؐ

لازم ہے اور متفق علیہ حدیث صحاح ستہ میں ہے صحیح ترمذی میں کہ رسولؐ تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے۔

عمل رسولؐ موجود...... تو پھر مسلمان کے لیے ہر ایک کے لیے کیوں نہ سنت ہو کہ وہ بیٹی کی تعظیم کو کھڑا ہو۔ مگر میں کیا کہوں کہ کسی بھی مسلک کی فقہ میں مجھے نہیں نظر آیا کہ واجب نہ سہی، مستحب ہی ہو کہ باپ بیٹی کی تعظیم کو کھڑا ہو۔ تو کیا یہاں اصول ٹوٹ گیا۔ ارے کہیے کہ علماء بھول گئے لکھنا...... اب ہم تصنیف کریں گے کوئی۔ تو ہم لکھ دیں گے...... اصول کا تقاضا یہی ہے کہ یہ کم سے کم مستحب تو ہونا چاہیے۔

مگر میں کہتا ہوں۔ اچھا صاحب علماء بیچارے سب بھول گئے۔ لیکن کیا بات ہے کہ اصحاب رسولؐ میں کسی نے اس کی پیروی نہ کی۔ کئی کئی ہزار صفحے کی کتابیں موجود ہیں۔ حالات صحابہ کی مجھے ایک صحابی نہیں ملتا کہ جو اپنی بیٹی کی تعظیم کو کھڑا ہوتا ہو۔ یہاں تک کہ ایسے ایسے صحابی جن کی بیٹیاں کسی حیثیت سے واجب الاحترام بھی ہو چکی ہیں مگر وہ بھی تعظیم کو نہیں کھڑے ہوتے۔ تو یہ کیا معمہ ہے کہ ایک سنت رسولؐ مسلما موجود...... اور کوئی صحابی اطاعت نہیں کر رہا ہے...... کوئی صحابی پیروی نہیں کر رہا ہے...... اور ہم یہ کہہ کر گزر جائیں گے کہ وہ کوئی معصوم تھوڑی تھے۔ معصوم تو کوئی بھی نہیں مانتا...... چاہے وہ بر بنائے عقیدت رد نہ کریں مگر معصوم اصولاً مانتا کوئی نہیں۔

تو جناب اب میں کہتا ہوں کہ جنہیں ہم معصوم مانتے ہیں جو بر بنائے قرآن و حدیث معصوم تھے اور جن کے گھر کی بات تھی۔ تو ان میں سے بھی کوئی اپنی بیٹی کی تعظیم کیوں نہیں کرتا...... اور کیسی کیسی صاحب صفات بیٹیاں...... امیر المومنین جناب زینب وام کلثوم کی تعظیم کیوں نہیں کرتے۔ آپ نے شاید کسی ذاکر سے سنا ہوگا کہ امام حسینؑ تعظیم کرتے تھے میں کہتا ہوں کہ وہ بھی بڑی بلندی ہے مگر وہ بات تو نہ ہوئی۔ وہ تو بھائی بہن کی تعظیم کیلئے کھڑا ہوا۔ امیر المومنینؑ کیوں نہیں کھڑے ہوتے۔ امام حسینؑ...... فاطمہؑ کبریٰ اور سکینہؑ کی تعظیم

کیوں نہیں کرتے۔ جناب موسیٰ کاظم معصومہ قم کی تعظیم میں کیوں نہیں کھڑے ہوتے۔ اب تو معمہ ہے یا نہیں کہ ایک عمل رسولؐ موجود نہ صحابہ عمل کر رہے ہیں۔ نہ اہل بیت عمل کر رہے ہیں۔ نہ چودہ سو برس میں علماء میں سے کوئی اُٹھتا ہے۔ کوئی مسلمان اس کی پیروی نہیں کرتا ہے اب معمہ سوائے اس کے حل ہو نہیں سکتا' جو میں کہوں۔ اُسے دنیا قبول کرے۔ ورنہ خود کوئی اس کا حل پیش کرے کہ اہل بیت یہی جانتے تھے۔ صحابہ یہی سمجھتے تھے۔ چودہ سو سال سے علماء اسلام یہی جانتے تھے۔ یہی سمجھتے تھے کہ یہ تعظیم بحیثیت بیٹی کے نہیں ہے یہ شخصیت فاطمہؑ کے لحاظ سے ہے۔

لہٰذا اصول اپنی جگہ قائم بے شک رسولؐ کا اتباع لازم۔ مگر اب قیامت تک مسلمانوں کو اس اتباع کے تقاضے میں...... بس احترامِ فاطمہؑ واجب ہے۔ تعظیم فاطمہؑ واجب ہے۔ اپنی بیٹی کی تعظیم کر کے اُس حکم کی تعمیل نہیں ہوگی اور یہی تو تھیں فاطمہؑ، جو مباہلے کا جزو بنیں۔ میدانِ مباہلہ میں ان کے عام دستور حجاب کو بھی قربان کیا گیا۔ یعنی یہ تو باپ کے خطبے میں کبھی مسجد کے اندر نہیں آئیں۔ برقعہ و چادر میں نہاں ہو کر بھی، چہ جائیکہ بیرون مدینہ، مباہلے کے میدان میں حکم الٰہی سے گئیں۔ ہاں بڑے اہتمام پردہ داری کے ساتھ گئیں۔ سر سے پیر تک برقعہ و چادر میں نہاں تھیں۔ آگے آگے حجاب رسالت پیچھے حجاب ولایت...... درمیان میں یہ عصمت صغریٰ...... اس شان سے گئیں۔ مگر فاطمہؑ زہرا کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر یہ نہ کہا جائے یہ نہ مانا جائے۔ یہ تو ان کا معیار حجاب تھا۔ اس کے لحاظ سے یہ قربانی آج انہوں نے بہ حکم الٰہی پیش کی۔

میں کہتا ہوں کہ آج گویا زہراؑ نے زینبؑ کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ پکار کے کہہ دیا کہ اے بیٹی...... یہ وقت کی بات ہے مجھے آج اتنی ہی قربانی کی ضرورت پڑی۔ لیکن کل کو اگر دین خدا کو ضرورت پڑی تو کسی حال میں کہیں جانے میں عذر نہ کرنا...... چہلم کے زمانے کی مجلس کے مصائب میں سے عرض کر رہا ہوں۔ مگر یہ تو عشرہ محرم

کی مجلس ہے۔

یہی مباہلے کی منزل...... میں کہتا ہوں کہ ذرا غور کیجیے۔ پہلے لفظ ''ابناءنا'' ہے اس کی نمائندگی میں حسنؑ و حسینؑ آئے ہیں۔ دوسرا لفظ اگر ''بناتنا'' ہوتی تو میں سمجھتا فاطمہؑ زہرا بیٹی ہونے کی حیثیت سے رشتے کی نمائندہ ہو کر آئی ہیں مگر ''ابنانا'' کے بعد وہاں ''بناتنا'' نہیں ہے۔ اب طبقے کا نام ہے صنف کا نام ہے ''نساءنا'' نساء کسی رشتے کا نام نہیں ہے اور میں قرآن مجید کے مطالعے کی دعوت دوں گا کہ حالانکہ نام تو صنف کا ہے، مگر قرآنی محاورات میں یہ سببی رشتے کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ ''یانساء النبی'' اے نبی کی عورتوں۔ کون یعنی ازواجِ رسولؐ...... تو یہ نساء کی لفظ سببی رشتے، اُس کے لیے قرآن میں آتی رہی ہے۔ آج وہی نساءنا کا لفظ آرہا ہے مگر آج اُس رشتے کی کوئی خاتون نہیں آگے آتی۔ بلکہ صنف کے معنی میں لے کر بیٹی لائی جارہی ہے۔ تو یہ بیٹی نمائندہ رشتے کی نہیں ہے صنف کی ہے اور اُس سے لمحہ فکریہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اُس رشتے کی کوئی فرد اس منزل پر لائے جانے کے قابل ہوتی تو دور بھی ہوتی تو بلا کے لائی جاتی۔ مگر یہ خاتون معظمہ لائی جارہی ہے۔ اب واقعہ تو یہی ہے لیکن لفظ ''نساء'' مجھے اس کے محل استعمال کی وجہ سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ فاطمہ جو آئی ہیں وہ ذاتی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ خود اپنی ذات کے ساتھ تو اصالتاً آئیں ہیں اور اپنی ماں کی نمائندہ ہو کر یہ نیابتاً آئی ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر وہ بیوی ہوتیں۔ خدیجہ کبریٰ موجود ہوتیں تو شاید اس منزل میں وہ مگر شاید یہ شاید کہنے کا مجھے حق ہے اس کے آگے کہنے کا مجھے حق نہیں، بہر حال واقعہ یہ ہے کہ فاطمہؑ زہرا اس صنف کی نمائندہ ہو کر آئیں اور اُس رشتے کی کوئی خاتون میدان مباہلہ میں جو کہ پُرامن میدان تھا...... خطرہ ان کے لیے ہوگا۔ جن کو حقانیت میں شک ہو، ورنہ خطرہ کوئی نہ تھا، اس پرامن میدان مباہلہ میں لانے کے لائق بھی، مستحق بھی کوئی رشتے کی عورت نہیں تھیں۔

اب بظاہر تو میں اصل مصائب سے بہت دُور ہوں مگر آپ دیکھیں گے کہ اس سے

بالکل دور نہیں ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کی قسم! اس رشتے کا وقار تو کربلا کی بہوؤں نے قائم کیا...... لیلیٰ وہ خاندان کی نہیں تھیں۔ رباب خاندان کی بیٹی نہ تھیں بہو تھیں...... مگر میں کیا کہوں؟ میں تو کہتا ہوں کہ ثانی زہرا زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا بتا سکتی ہیں...... وہی کہہ سکتی ہیں...... گواہی دے سکتی ہیں کہ کوئی منزل امتحان ایسی نہیں جس میں لیلیٰ مجھ سے پیچھے رہی ہوں...... کوئی مصیبت ایسی نہیں جس میں رباب نے میرا ساتھ نہ دیا ہو۔ بخدا اس رشتے کا وقار پہلی دفعہ کربلا کے میدان میں سامنے آیا۔ ان کے صبر و ضبط کی منزل...... مولاؑ کو کربلا میں تردد کبھی نہیں ہوا...... پریشانی اور چیز ہے...... ملال اور چیز ہے رنج اور چیز ہے۔ ''تردد'' یعنی طے نہ کر سکنا کہ کیا کروں...... تردد مولاؑ کو کربلا میں کبھی نہیں ہوا۔ صرف ایک منزل پر تردد ہوا...... وہ کون سی منزل ہے...... جب ہاتھوں پر لائے تھے بچہ اور اب لاش...... کبھی اور تردد نہیں ہوا کیونکہ جو گیا، ماں جانتی تھی کہاں جا رہا ہے...... جانتی تھی کہ ایسی جگہ جا رہا ہے جہاں سے کوئی زندہ واپس نہیں آتا، لہٰذا تردد کوئی نہیں...... مگر وہ اسے یہ کہہ کے لے گئے تھے کہ پانی پلانے لے جا رہا ہوں یا دوسری روایت کے مطابق رخصت کرنے کو اس کو بلایا ہے اور اب کیا ہے...... تردد یہ ہے کہ ربابؑ سے جا کر کیا کہیں۔

اب ماشاءاللہ آپ میں سے ہر فرد وہ ہوگا جو عمل عاشور کا پابند ہوگا۔ روز عاشور دو طریقے ہیں اعمال کے ایک وہ جس میں سو دفعہ صلوات وغیرہ اور ایک دوسرا طریقہ ہے......

وہ دوسرا طریقہ کیا ہے سات دفعہ قدم آگے بڑھاتے ہیں اور سات دفعہ قدم پیچھے ہٹاتے ہیں اور زبان پر کیا ہوتا ہے اناللہ وانا الیہ راجعون۔ امامؑ نے تو طریقے عمل کے سکھا دیئے۔ اس کی وجہ امامؑ نے نہیں بیان فرمائی۔ علماء نے یہ کہا کہ وہ شاید امامؑ کے اس عمل کی تشبیہ ہے اور وہ موقع یہی تھا کہ جب شیر کا لاشہ امامؑ کے ہاتھوں پہ تھا اور چاہتے تھے کہ خیمے میں جاؤں مگر پھر جیسے جی نہیں اٹھتا تھا اور کیا کروں امام کی جلالت الفاظ کے انتخاب میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہے۔ مگر عظمت مصیبت کے لحاظ سے مجھے اور لفظ ہی نہ ملیں تو کیا کروں۔

میں کہتا ہوں کہ جیسے ہمت نہیں ہورہی تھی...... ارے رباب سے کیا کہوں جا کے...... اس لیے آگے بڑھتے ہیں...... پھر پیچھے چلے جاتے ہیں...... کیا کہوں جا کے...... پھر قدم آگے بڑھاتے ہیں...... پھر پیچھے چلے آتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ یہ عدد تو جیسے اس خاندان سے خصوصیت رکھنے لگا تھا۔ حاجرہ کے وقت کہ منیٰ کے میدان میں وہ بھی سات دفعہ گئی تھیں اور سات دفعہ آئی تھیں۔ مولا نے بھی سات دفعہ قدم آگے بڑھائے اور سات دفعہ قدم پیچھے ہٹائے۔ یہ گویا میدان کربلا کی ''سعی'' تھی جو مولا کی طرف سے اس عالم مصیبت میں عمل میں آرہی تھی اور گویا سمجھ میں نہیں آتا اور آخر میں...... اب مجھے تو اردو زبان میں یہی لفظیں ملتی ہیں کہ آخر میں گویا دل پر پتھر رکھ کے اور ہمت کر کے خیمے میں قدم رکھا مگر زبان سے کہا کچھ نہیں گیا...... جو ہاتھ میں تھا وہ رباب کی گود میں منتقل کر دیا۔ بس ہے۔ آپ رباب کے صبر و ضبط کو دیکھیے...... رباب نے دیکھا اور دیکھ کے محسوس کر لیا کہ جو گیا تھا وہ کون تھا اور جو آیا ہے وہ کیا ہے۔ پہلی نگاہ میں محسوس کر لیا اور مولا کے تاثراتِ نفس کا اندازہ کر لیا کہ مولا کو مجھ سے شرمندگی ہے...... خدا کی قسم ایک جملہ علی اصغر کے مرثیہ میں کہا ہے کہ اس پر غور کیجیے کہ وہ جملہ مرثیہ بھی ہے اور وہ گویا مولا کی طرف سے معذرت بھی ہے۔

او بیٹے کیا تیرا ایسا بھی ذبح کرنا بھی جائز تھا مطلب یہ کہ مولا شرمندہ نہ ہوئیے دنیا میں کبھی یہ ہوا ہے جو آپ کے ساتھ ہوا۔

میں کہتا ہوں کہ بیٹا وہ گیا ہے کہ مولا اپنی جگہ پہ کھڑے نہیں رہ سکے۔ جسے رخصت کیا...... اُسے رخصت کر ہی دیا...... مگر جب علیؑ اکبر گئے تو...... مولا گھوڑے کے پیچھے پیچھے دور تک چلے گئے اور کہا بیٹا جہاں تک سامنا ہو...... مڑ مڑ کے دیکھتے رہو اور آپ تصور کیجیے لیلیٰ نے قدم خیمے سے آگے نہیں نکالا ہاں خیمے کے اندر بھی بیٹھا نہیں گیا۔ در خیمہ پر...... در خیمہ پر کھڑی ہوئیں...... یہی ضبط و تحمل بہت مگر پس پردہ کھڑی ہوئی ہیں...... اس طرح پھر بھی کہ بظاہر مولا کو بھی راز ہے...... مولا کو جیسے نہیں معلوم ہے کہ لیلیٰ کھڑی ہیں...... یہی صبر و

ضبط کیا کم ہے کہ اُدھر نہیں دیکھتیں...... جدھر علی اکبر گئے ہیں...... کیونکہ ادھر نامحرم کی فوج کے سپاہی ہیں...... بس مولا کے چہرے پر نظر ہے کہ امام بھی مگر یہ کہ باپ کا دل ہے...... اگر میرے بیٹے کو کوئی زخم آئے گا تو امام کا چہرہ متغیر ہو جائے گا۔

ہاں اہلِ عزا۔ وہ وقت آگیا کہ ایک دفعہ امام کا چہرہ متغیر ہوا اور لیلیٰ نے تڑپ کر پوچھا...... کیوں مولا میرے بچے کی تو خیر ہے...... امامؑ نے فرمایا کہ ہاں تمہارا بیٹا ابھی صحیح سلامت تو ہے مگر ایک نامی پہلوان آگیا ہے وہ سیر و سیراب ہے اور میرا بچہ تین دن کا بھوکا پیاسا ہے مجھے اس کے مقابلے میں علی اکبرؑ کے لیے ذرا خطرہ ہے اور فرماتے ہیں...... لیلیٰ یہاں کیا کھڑی ہو...... میں نے نانا سے سنا ہے کہ ماں کی دُعا بیٹے کے حق میں قبول ہوتی ہے...... جاؤ خیمے کے اندر...... علیؑ اکبر کی فتح کے لیے دُعا کرو۔

حکمِ امامؑ سے لیلیٰ خیمے میں گئیں...... مگر یہ سوچتی ہوئی کہ اگر فقط دُعا ہی کرنا تھی تو خود ہی کیوں نہ کر دی...... مجھ سے کیوں کہا؟ معلوم ہوتا ہے میرا در خیمہ پہ کھڑا ہونا بھی امامؑ کو مناسب نہیں معلوم ہوا...... اس لیے لیلیٰ نے امام کے کہنے سے دعا تو مانگ لی...... مگر دعا کر کے پھر خیمے کے دروازے پر نہیں آئیں...... علیؑ اکبر کی لاش آگئی...... وہ درِ خیمہ پہ نہ آئیں۔

......☆......

# مجلس ہفتم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا
(جاثیہ:۱۸)

ترجمہ: ہم نے تم کو دین کے کھلے رستہ پر قائم کردیا ہے تو اسی رستہ پر چلو جاؤ۔

ہوائے زمانہ کے لحاظ سے کل کا موضوع اتنا خطرناک تھا کہ مجھے خیال ہوتا تھا کہ فریاد ہوگی کہ آپ نے اس زمانے میں اس دور میں اس موضوع کو چھوا (چھیڑا) کیوں۔ مگر یہ کہ خلافِ توقع حضرات نے کہا کہ وہ بھی بڑی چیز تھی اور مزید اس کے اوپر بیان ہونے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا جناب آج کا بیان ایسے شعبے سے متعلق ہے کہ جس پر خوش نصیبی یا بدنصیبی سے میں خود عامل نہیں ہوں۔ مگر وکالت تو مجھے کرنا ہی ہے نظام شریعت کی طرف سے اور ان حضرات کی بھی وکالت ہو جائے جو اس پر عامل ہیں اور وہ ہے تعدد ازواج...... تو یہ بڑا عظیم انسانی مسئلہ اور قطع نظر اس مطالبہ ترمیم کے شریعت میں اور وہ اس سے پہلے سے' مدتوں سے...... اور یہ چیز اصل میں سات سمندر پار سے آئی۔ یعنی عیسائی دنیا نے اس پر اعتراضات شروع کیے اور اسکے اثر سے یہ چیز پھر مسلمانوں کے درمیان بھی آئی اور اب اس ذیل میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مقدسہ پر بہت بڑا گویا عذر' (''تعدد ازدواج'' سرکار کا جرم) دنیا کے ہاتھ میں حربہ آ گیا ہے۔ جو اصل قانون تعدد ازدواج پر ظاہر ہے معترض ہوں وہ پھر حضرت کی سیرت مقدسہ پر اور شدت سے اعتراض کرتے ہیں۔ کیونکہ قانون میں تو پھر بھی تعداد کم اور حضرتؐ کی سیرت زندگی میں دیکھتے ہیں کہ خصوصی طور کے اوپر حضرتؐ کے ہاں تعداد میں اضافہ تو اب وہ جتنا زوردار اعتراض اصل

قانون پر تھا۔ اُس سے زیادہ زوردار اعتراض حضرتؐ کی سیرت مقدسہ پر ہو گیا اور اس لیے یہ اعتراض بھی اُسی جماعت کے نکلا جو سیرت رسولؐ کو بھی داغدار بنانا چاہتی تھی اور قانون اسلام پر بھی اعتراض کرنا چاہتی تھی اور اُس کے دیکھا دیکھی پھر ترقی یافتہ مسلمانوں میں اور جن پر اُن کے اعتراضات ضمنی تھے۔ انہوں نے اس کو لے کر...... اب یہ سیرت پیغمبرؐ پر اعتراض کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ کیونکہ مسلمان رہنا ہے تو انہوں نے بس قانون کو لیا۔ حالانکہ قانون پر اعتراض ہو تو میں نے کہا کہ اُس کا درجہ حضرتؐ کی سیرت پر اعتراض میں اور بڑھ جاتا ہے مگر وہ تو کیونکہ غیر تھے تو کھل کے انہوں نے سیرت پر اعتراض کیا اور میں کہتا ہوں کہ ضمناً قانون پر اعتراض کیا...... اصل نصب العین اُن کا وہی تھا۔ اب ان کو بیچاروں کو اپنا اسلام بھی سنبھالنا ہے۔ لہٰذا یہ سیرت پر براہِ راست حملہ نہیں کرتے اور یہ بس بیچارے قانون کو لیتے ہیں۔ قانون پہنچانے والے اب وہ سب وہاں ہیں۔ علماء کو چاہیے جو کہہ لیجیے اسلام کا پتا بل جائے گا لہٰذا اصل حملہ تو سیرت پر ہے۔ سیرت سے تو درجہ یہاں پیچھے ہے قانون کا۔

مگر اب مسلمان رہتے ہوئے۔ بس قانونِ اسلام اور اس کی بناء کے اوپر جہاں اقتدار حاصل ہے وہاں اس کے مطابق ترمیم بھی ہو گئی۔ یعنی وہ تو مطالبہ ہے پرنسل لاء کا۔ لیکن اب مجھے یہاں کا حال نہیں معلوم مگر یہ کہ ہمارے ملک میں کم سے کم ملازمین سرکار کے لیے منافی استحقاق ہو گیا تعدد ازدواج کہ ایک طرح کا تو جرم ہو ہی گیا کہ عوام کا جرم...... اب یاں کا حال مجھے تو نہیں معلوم مگر وہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر میرے علم میں ہے کہ شاہ کے زمانے میں ایران میں بھی تعدد ازدواج کا دروازہ قانونی طور پر بند ہو گیا تھا۔ تو یہ بہت بڑا اہم معاملہ ہے جو باب سیرت سے بھی متعلق ہے اور اخلاق کے نظام سے بھی متعلق ہے تو اب میرا موضوع تو یہ قانون ہے اب سیرت کا جز۔ تو آج گویا درمیان میں بہ تقاضائے مناسبت اور لازم و ملزوم کے تقاضے کے لحاظ سے آئے گا۔

تو اب قانون کے لحاظ سے ایک اصولی بات میں عرض کرتا ہوں۔ بات تو ایسی ہے کہ جو پرانی نہیں' ہر ایک کے سامنے کی ہے مگر شاید اس رُخ پر توجہ بڑے بڑے ذہین افراد کی اور ترقی یافتہ افراد کی بھی نہیں ہوئی۔ مردوں سے کہا جاتا ہے تم تعدد ازواج نہ کرو۔ بالکل نمایاں یہ ہے کہ جو کچھ...... مجھے یہ بھی...... یہاں کی باتیں میرے لیے سنی سنائی ہوتی ہیں کہ ایک وقت میں آپکے ہاں بڑے بڑے جلسے ہو چکے ہیں تعدد ازواج کے خلاف گویا مہم چلائی جا چکی ہے۔ جہاد ہو چکا ہے باقاعدہ اور بڑے بڑے جلسے ہو چکے ہیں۔ اس کے خلاف تو سب گویا مردوں کے جلسے' مردوں کو گویا کہنا یہ ہے کہ تعدد ازواج غلط ہے...... اس کی تبلیغ...... مگر میں جس قانونی نکتے پر توجہ دلا رہا ہوں۔ اس کو فرصت کے لمحات میں ہر قانون دان جانچ لے۔ ہر صاحب عقل جانچ لے۔ شریعت اسلام میں "عقد" کام کس کا ہے یاد رکھیے کہ میں نے کہا کہ وہ ڈھکی ہوئی چیز تھوڑی ہے آج کل ہر ایک کا مشاہدہ ہے۔ ایجاب و قبول میں ایجاب کس کی طرف سے ہوتا ہے۔ حضور...... ایجاب ہوتا ہے لڑکی کے وکیل کی طرف سے...... اور قبول ہوتا ہے لڑکے کے وکیل کی طرف سے...... تب وقارِ خواتین کے لحاظ سے خواستگاری کی منزل پر کہا کہ پیشقدمی مرد کی طرف سے ہونا چاہیے۔ یعنی پیغام دینا مرد کا کام ہے یا مرد کے بزرگوں کا...... یہ میں کہتا ہوں کہ وقار خواتین کے لحاظ سے ہے۔ اس طبقے کو مطلوب ہونا چاہیے طالب نہیں ہونا چاہیے۔ خواستگاری کی منزل میں ابتداء ہونا چاہیے۔ مرد کی طرف سے...... لیکن جب طے پا گیا۔ تو رشتہ ازدواج کا حصول جس معاہدے پر موقوف ہے۔ اس معاہدے میں ابتداء ہے لڑکی کی طرف سے یعنی صنف خواتین کی طرف سے...... وہ تو صنف خواتین میں جس کا نکاح ہو وہ لڑکی کہلائے گی۔ جیسے آجکل جب تک یونیورسٹی کی طالب علم ہو تب تک لڑکی رہتی ہے چاہے کتنی ہی عمر ہو جائے اور جب تک وہاں پڑھتا رہے تب تک لڑکا ہے چاہے کتنی ہی عمر ہو جائے' ویسے ہی عقد کے معاملے میں کہ جس کا عقد ہوا۔ وہ صنف خاتون وہاں اُن میں سے۔ وہ لڑکی ہے اور جس

نے عقد کیا۔ آپ کی زبان میں وہ لڑکا ہے' یہ بعد میں معلوم ہو گا کہ...... بڈھا ہے۔ تو حضور والا عقد کی منزل پر ابتداء ہے لڑکی کی طرف سے۔ وہ لڑکی کا جو وکیل ہے وکیل تو مجبوراً ہے ورنہ اصل تو لڑکی ہے۔ اگر خود صیغہ ایجاب وقبول جاری کر سکیں۔ تو بہت اعلیٰ درجہ کا عقد ہو گا۔ یہاں تو دوسرا واسطہ ہے وہ تو خود صاحب امر (عمل) ہیں۔ تو اصل لڑکی ہے اور جو وکیل ہے وہ تو لڑکی کی طرف سے صیغہ عقد جاری کرتا ہے' یہ تو لڑکے کا وکیل ہے۔ جو لڑکے کی طرف سے صیغہ عقد جاری کرتا ہے اصل تو معاقدین ہیں لڑکا اور لڑکی۔ تو پیش قدمی یہاں لڑکی کی طرف سے ہے۔ تو مردوں سے کیا کہنا ہے کہ تم عقد نہ کرو۔ تعدد ازواج نہ کرو۔ خواتین کی کانفرنس ہونا چاہیے۔ وہ طے کرلیں کہ ہم کسی ایسے شخص سے عقد نہیں کریں گے۔ جس کے حبالہ زوجیت میں ہماری ہم جنس کوئی فرد پہلے سے ہے پھر انہیں کسی قانون سے' شرع سے' مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس کو طے کرلیں۔

اب جناب تعدد ازواج کا شوق رکھنے والے مجھ سے شاکی ہونگے کہ آپ نے نسخہ بتا دیا۔ لیکن یاد رکھیے کہ اگر خواتین اجماع کرلیں تو پوری تختی پڑھ ڈالے قَبِلْتُ کی۔ مگر وہ رشتہ قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ لڑکی کسی کو وکیل نہ کرے یا جب تک کہ لڑکی خود صیغہ عقد اپنی طرف سے جاری نہ کرے۔ اُس وقت تک مرد بے بس ہے۔ تو مردوں سے کہنے کی بات نہیں ہے کہ تم تعدد ازواج نہ کرو۔ یہ بس میں ہے خواتین کے خود...... اور اب وہ میں نے کہا کہ ایک وقت میں آپ کے ہاں جلسے ہو چکے اور میں نے کہہ دیا کہ سنی سنائی بات ہے یہ میرے لیے۔ مشاہدہ تو یہاں کے حالات کے لحاظ سے مجھے کہاں ہے کہ مجھے یہی معلوم ہوا کہ اُن بڑے جلسوں کی جن خاتونِ محترمہ نے صدارت فرمائی وہ خود اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھیں۔ تو اگر خواتین میں سے ہر ایک طے کرلے یہ۔ لڑکیاں طے کرلیں۔ لڑکیوں کے والدین طے کرلیں کہ ہم کبھی عقد نہیں کریں گے کسی ایسے کے ساتھ' جس کے حبالہ زوجیت میں کوئی پہلے سے خاتون ہیں تو مرد بے بس ہو جائیں گے۔ وہ شادیاں کر ہی نہیں سکتے۔

لیکن جب شادی کی منزل آئے گی تو تو بسا اوقات کچھ کوشاں ہوں گے۔ بسا اوقات کچھ تحریر کریں گے۔ وسائل تحریر کریں گے اور بعد میں ترقی یافتہ ہو کر ترقی پسندانہ ثبوت دیں اپنے نظریات کا۔ کہ ہم ہیں جو بڑے تجربہ کے بعد جانتے ہیں کہ یہ کیوں ہوتا ہے۔ تو یہ تو اصولی بات ہے کہ اصل یہ عمل لڑکیوں کا ہے کہ اگر لڑکیاں نہ کرنا چاہیں شادی...... نہ کریں اور پھر کوئی مولوی حق نہیں رکھتا کہ وہ فتویٰ دے کہ نہیں تم ضرور تیار ہو جاؤ۔ کسی لڑکی پر واجب نہیں کہ وہ کسی ایسے سے عقد کرے کہ جس کی کوئی پہلے سے زوجہ موجود ہو۔ اب براہ راست یہ تو اصولی بات ہے قانون کی۔ لیکن اب اصل نظام میں آخر یہ تعدد ازواج کا دروازہ کھلا ہی کیوں ہے...... تو میں نے کہا کہ یہ اصل میں صدا بلند ہوئی ہے عیسائی دنیا سے۔ ان کے تبلیغ کا یہ جز ہے۔ اُدھر سے آیا ہے تو اب اس میں رُوح کیا ہے؟

اُن کا حق بجانب تھا اُس پر آواز بلند کرنا۔ کیونکہ یہ سوال اُٹھا ہے۔ اُدھر سے جن کے حلق سے "ایک شادی" نہیں اُتری ہے۔ یعنی وہاں تو مثالی زندگی یہ ہے کہ اکیلا پیدا ہوا ہے...... اکیلا اُٹھ جائے، دوکیلا بنے ہی نہیں۔ ایک شادی بھی جن کے حلق سے نہ اُتری ہو...... مجبوراً گویا کرتے ہیں وہ شادی...... یہ سمجھ کہ ہم اپنے روحانیت کے تقاضوں کو ہاتھ سے دے رہے ہیں۔ ورنہ روحانیت کی منزل اگر قائم رکھنا ہے۔ تو ایک عدد شادی بھی نہ کریں اور اسی لیے جو علماء ہیں۔ وہ نہیں کریں گے۔ جو راہب ہیں۔ راہب ہونا اُن کے نزد ایک بہت بڑا مذہبی منصب ہو گیا۔ وہ نہیں کریں گے۔ جو عبادت، عبادت کدوں کی خادمائیں ہوں گی۔ گویا خصوصیت رکھنے والی۔ وہ خواتین بھی نہیں کریں گی۔ کیونکہ وہ اونچے طبقے کی مانی جائیں گی۔ یعنی انفرادی زندگی گزارنا ان کے ہاں معیار روحانیت ہے تو جب معیار روحانیت صرف انفرادی زندگی ہے۔ ایک شادی کرنا بھی اُن کے ہاں، گویا دنیا میں پھنس جانا ہے۔ تو وہ اپنے نقطہ نظر سے تعدد ازواج کو مورد اعتراض سمجھیں۔ تو یہ ان کے اصل نظام کے تقاضوں کے خلاف نہیں ہے...... لیکن شریعت اسلام میں جب سے نظام

رہبانیت جرم بن گیا۔ یعنی پیغمبر اسلام نے اعلان کر دیا کہ لَا رَھبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَام۔

جیسے شرک کی گنجائش نہیں ویسے رُہبانیت کی گنجائش نہیں۔ اعتقادی طور سے شرک کا دروازہ بند...... عملی طور سے رُہبانیت کا دروازہ بند...... اور اب اُس پر مستقل بیان تو اس وقت ہے نہیں۔

نظام مادیت وروحانیت یعنی رہبانیت پر مستقل تقریر نہیں ہے مگر ضمناً میں کہتا ہوں کہ وہ ہم جنہیں سمجھتے ہیں کہ جب شادی بیاہ ہو گیا تو اب اللہ کی یاد کہاں ہو سکتی ہے۔ اب تو بیوی کی محبت دامنگیر ہے اب تو بیٹوں کی محبت ساتھ ہے۔ اس لیے مثالی زندگی وہ ہے کہ نہ شادی نہ بیاہ ہو۔ جب شادی بیاہ نہ ہو تو اور رشتے کہاں سے۔ اصل تو رشتوں کی بنیاد پھر قائم ہوتی ہے۔ اس ذریعے سے پھوٹا کرتی ہے۔ تو ہر ایک انفرادی زندگی اس کی معراج کمال ہے تو یہاں معیار یہ تھا...... کہ نہیں...... وہ کہتے ہیں کہ خدا کی بادشاہت میں یعنی منزلت قرب الٰہی میں وہ داخل نہیں ہو سکتا۔ جس کی شادی ہو جائے ہمارے یہاں کا اصول یہ کہ شادی شدہ کی نماز میں جتنا ثواب ہے اُتنا غیر شادی شدہ کی نماز میں ثواب نہیں۔ اگر آپ بڑے یاد الٰہی کرنے والے ہیں تب بھی عبادت کو اپنی حد کمال تک پہنچانے کے لیے شادی کیجئے۔ یعنی اس کو ایک عام مثال سے کہوں کہ یہاں مرد جو بچے ہیں وہ تو اصطلاحاً لڑکے ہیں یعنی پڑھ رہے ہیں تعلیم حاصل کر رہے ہیں تو وہ بھی اس کے تقاضے سے واقف ہیں۔ جو پڑھ کے لڑکپن کی حدود سے گزر چکے ہیں۔ وہ بھی کبھی تو لڑکے رہ چکے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی واقف ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ بعض طالب علم ایسے ہیں کہ امتحان کے موقعے پر بیچاروں کو کوئی ویرانہ تلاش کرنا پڑتا ہے کسی کھنڈر میں جاتے ہیں کیونکہ گھر میں بیٹھ کے کتاب دیکھنا چاہی تو کوئی ذکر چھڑ گیا۔ کتاب آنکھوں کے سامنے تھی دل اُدھر...... اور کوئی بچہ رو دیا۔ ذہن اُدھر متوجہ ہو گیا۔ کتاب غائب اور بیچاروں کو امتحان دینا ہے۔ علم حاصل کرنا نہیں کوئی ڈگری حاصل کرنا تو ہے ہی۔ لہٰذا وہ بغیر امتحان کے نہیں ہو گی بغیر پاس ہوئے نہیں ہو گی۔ تو تیاری

بہر حال کرنا ہے اور تیاری گھر میں ہو نہیں سکتی۔ لہٰذا جنگل میں جائیں گے لہٰذا کسی دریا کے کنارے جائیں گے۔ اب مجھے کراچی کا تو جغرافیہ معلوم نہیں جو میں یہاں نام لے لے کے کہوں کہ وہاں جائیں گے...... وہاں جائیں گے...... جہاں کم سے کم شناسا آدمی اس وقت نہ ہو۔ مخل نہ ہو بالکل سناٹا ہو حتی الامکان بغیر اس کے تیاری ہو نہیں سکتی، مگر جو ذوق علم رکھنے والا طالب علم ہے وہ گھر میں بیٹھ کر امتحان کی تیاری کرتا ہے اور جب کتاب سامنے آگئی تو کتاب کا ہو گیا پھر کوئی چاہے اُس کا نام لے کے پکارے تو بھی نہ سنے اُس کا ذہن پھر کسی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ تو نظام رُہبانیت والوں نے یادِالٰہی کو اُس اچاٹ ذہن والے طالب علم کی سی یاد رکھا ہے کہ اگر خدا کو یاد کرنا ہے تو جنگل میں جاؤ۔ خدا کو یاد کرنا ہے تو آبادی میں نہ رہو۔ خدا کو یاد کرنا ہے تو شادی نہ کرو۔ خدا کو یاد کرنا ہے تو بچے پیدا نہ ہوں۔ خدا کو یاد کرنا ہے تو گویا عزیز و اقارب سے مطلب نہ رکھو جنگل میں جاؤ۔ تو میں کہتا ہوں کہ یہ یادِالٰہی کون سی مشکل ہے جب جنگل ہے ہو کا میدان ہے سناٹا ہے۔ نہ عزیز ہے۔ نہ اقارب ہیں۔ نہ بیوی ہے۔ نہ بچے ہیں نہ اولاد ہے۔ نہ ہمسایہ ہے کوئی ہے نہیں تو خدا یاد نہیں آئے گا تو کون یاد آئے گا۔ اسلام کا معیارِ عبادت یہ ہے کہ کثرت میں رہو اور وحدت کا جلوہ دیکھو۔

تمام علائق ساتھ ہوں۔ تمام زنجیریں پیروں میں پڑی ہوں۔ تمام تعلقات محبت ہوں اور یہاں کمالِ بندگی اس میں بھی نہیں کہ بچے ہوں مگر ان کی محبت نہ رکھو...... نہیں...... یہ دین فطرت ہے محبت نہیں رکھتے ہو تو تم دینی حیثیت سے کوئی کامل ہی نہیں ہو۔ زوجہ ہے مگر اُس سے لگاؤ نہ رکھو...... نہیں...... اگر زوجہ ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اس سے لگاؤ رکھو...... قلبی وہ تو رشتوں کے جو تقاضے ہیں انہیں بھی پورا کرو۔ لیکن اس کے ساتھ امتحان اس کا ہے کہ یہ علائق تم کو یادِالٰہی سے روکتے تو نہیں، اور یہی فلسفہ ہے کہ غیر شادی شدہ کی نماز میں وہ ثواب نہیں جو شادی شدہ میں ہے کیونکہ اُس کی نماز بس نماز ہے اور اس کی نماز...... نماز بھی

ہے اور ایک جہادِ نفس بھی ہے۔ تو یہاں علائق کے بڑھنے سے اور بھی یادِ الٰہی یعنی فرائض کے احساس کے قائم رہنے سے فرائض کی اہمیت میں اور وزن میں اضافہ ہوتا ہے اور جتنا ان کے وزن میں اور گویا جہادِ نفس میں اضافہ ہو۔ اُتنا ہی اجر میں اضافہ ہوتا ہے یہاں جب تک کہ کہا گیا تھا۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِ۔ (آل عمران:۳۱)

کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرے نقش قدم پر چلو۔

میرا اتباع کرو۔ یعنی زبانی تعلیم یہاں نہیں ہے فقط بلکہ عملی مثال ہے اور مقصد رسالت ہوتا ہے حجت تمام کرنا قرآن میں ہے۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ہم نے پیغمبر بھیجے ہیں۔ بشارت دینے والے کرنے والے تاکہ خلق خدا کے پاس پیش خدا حجت باقی نہ رہے پیش کرنے کیلئے یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم کیا کریں۔ ہماری تو ہدایت ہی نہیں ہوئی۔ تو رسالت کا مقصد ہوتا ہے حجت تمام کرنا کہ خلق خدا کے پاس عذر نہ رہے۔ اب پیغمبرؐ خدا کی حجت فقط زبانی نہیں پیدا ہوئی بلکہ عمل کے درجے میں دنیا کے سامنے مثال قائم کرنے کے ساتھ۔

تو اگر رسول ﷺ انفرادی زندگی گزارتے کہ شادی بیاہ نہ کریں تو حجت ہرگز تمام نہ ہوتی، ہم کہہ سکتے کہ سرکار اگر آپ نے عبادت ایسی کی اگر آپ نے فرض شناسی سے اتنا کام لیا۔ تو آپ نے تو نہ شادی کی۔ نہ آپ کی بیوی نہ آپ کے بچے آپ کو کیا معلوم کہ بچہ ضد کر دے تو باپ پر کیا گزر جاتی ہے آپ کیا جانیں۔ ماشاءاللہ آپ کی اُردو میں ذرا سے فرق کے لحاظ سے محل بدلنے کے ساتھ لفظیں بدل دیں تو بچوں میں میں نے کہا کہ اگر بچہ ضد کردے تو کیا گزرتی ہے اور آپ کو کیا معلوم کہ بیوی اگر بضد ہو کے کچھ کہہ دے تو پھر شوہر پر کیا گزر جاتی ہے تو پیغمبرؐ کے پاس گویا اس کا جواب نہ ہوتا۔ مگر یہ حجت تمام کر دی گئی کہ دیکھو شادی پہلے کرائی جائے گی۔ اعلانِ رسالت بعد کو ہوگا۔ یعنی خالق خاتم الانبیاء نہیں بنانا چاہتا کسی

ایسے کو جو ان زنجیروں میں گرفتار نہ ہو۔ پچیس برس کی عمر میں شادی ہوگی اور اس دور میں متعدد اولاد ہوگی اور اس کے بعد چالیس برس کی عمر میں مبعوث بر رسالت ہوں گے اس کے معنی یہ ہیں کہ شادی شدہ کو خدا خاتم الانبیاء بنائے گا۔

اب حجت خلق خدا پر تمام ہوگئی۔ اب نہیں کہہ سکتے آپ کو کیا خبر۔ اور جناب خدیجہؑ کی زندگی میں تو اور کوئی نہیں کیا دوسرا عقد۔ یعنی آپؐ نے وحدت زوجہ کی بھی مثال پیش کر دی لیکن قدرت کا نظام...... ہدایہ...... کہ تقدیر تو اس کے ہاتھ میں رہتی ہے اگر جناب خدیجہؑ ہی رہتیں اور بس ایک ہی عدد اور اس طرح حضورؐ نے بتا دیا ہے کہ دیکھو اوصاف کے لحاظ سے کوئی بیوی ایسی مثالی ہو سکتی ہے جو اس کے ساتھ کوئی شریک نہ قرار دی جائے۔

لیکن اگر جناب خدیجہؑ ہی رہتیں...... اب یہ محل وہ ہیں کہ جہاں بعض لوگوں کا ذوق ہوگا کہ پھیلا کے بات کہیں اور میرا ذوق یہ ہے کہ بس اصل بات کہہ دی جائے۔ لمحہ فکر یہ...... سوچنے کے لیے اور پھر اُسے پھیلایا نہ جائے۔ جہاں کسی کی دل شکنی کا اندیشہ ہو اُسے کیوں بار بار دھرایا جائے مجھے کوئی شوق کسی کے دل دُکھانے کا نہیں ہے مگر جو اصولی بات ہے وہ عرض کر رہا ہوں کہ اگر جناب خدیجہؑ ہی رہتیں اور اُن کے سامنے تو بس ایک ہی تھیں۔ تو پھر ہم پر حجت تمام نہ ہوتی اور ہم کہہ سکتے تھے کہ سرکار والا! آپ کی تو ایک بیوی تھیں اور قدرت کی طرف سے وہ آپ کے ایسے موافق مزاج۔ آپ کو ایسی ملیں...... آپ کو کیا خبر کہ ہمارے لیے کیسے سابقے پڑتے ہیں۔ تو قدرت نے یہ حجت بھی تمام کر دی کہ دیکھو ہر مزاج کی ہر طبیعت کی زوجہ ہیں۔ اور اس کے بعد پوری ذمہ داری مطالعہ کے ساتھ کہتا ہوں بیویوں کی محبت کے اظہار میں ایسی غلط روایتیں آگئی ہیں کہ جن کو ہم شانِ رسالت کے خلاف سمجھتے ہیں اور اس لیے اُسے غلط ماننے پر مجبور ہیں اور ہے غلط، لیکن کسی بنو امیہ کے کارخانے میں بھی گھڑی ہوئی کوئی ضعیف روایت بھی ایسی نہیں آئی کہ کسی بیوی نے شکوہ کیا ہو کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی۔ تو یہ سیرت رسولؐ کا ایک اہم گوشہ ہے۔

قرآنِ مجید نے کہہ دیا: فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (النسآء: ۳) اگر عدل سے کام نہ لو تو پھر خبردار پھر تعدد ازواج بھی' قرآن کی آیت ہے کوئی روایت تھوڑی ہے ''اگر عدل نہ کر سکو تو بس ایک'' یعنی پھر تمہیں حق نہیں ہے تعدد ازواج کے قانون سے فائدہ اُٹھانے کا تو ہمت ہو عدل کی۔ تو قدم آگے بڑھایئے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے...... انہوں نے تو یہ بھی کہا کہ دیکھو میں زنجیروں کو تم سے زیادہ بڑھائے لیتا ہوں لیکن پھر بھی دیکھو کہ یادِ الٰہی میں کمی تو نہیں ہوتی ہے فرائض الٰہیہ میں ذرہ بھر بھی کمی تو نہیں ہوتی ہے جہاں دین و دنیا کے مشاغل ایک ذات پر مدغم ہو گئے ہیں اور وہاں کوئی بھی فرد چھوٹے سے چھوٹا بلکہ ہمیشہ قانون کے درجے سے اپنے عمل کی منزل کو آگے بڑھایا ہے ہمارے لیے نمازِ شب مستحب اور پیغمبرؐ کے لیے جزو فرائض۔

یہ اضافہ ہے آپ کے لیے...... یعنی سب کیلئے پنجگانہ واجب، وہ دنیا کے رہنما ہوتے ہوں گے۔ کہ کہیں زیادہ اور کم کریں...... یہ اسلام کا نظام ہے کہ یہاں کہا کم جاتا ہے اور عمل زیادہ رکھا جاتا ہے قانون پیچھے رہ جاتا ہے اور قانون کا جو علمبردار ہے۔ اُس کا کردار آگے رہتا ہے تو یاد رکھیے کہ یہ تعداد کا بڑھانا...... یہ فرائض کی شدت کو اور زیادہ کرنا تھا۔ حجت تمام کرنا خلقِ خدا پر کہ تم فرض کیجیے کہ ایک سے زیادہ دو رکھو تو عدل نہیں کر سکتے اور نہیں رکھ سکتے چہ جائیکہ دیکھو اتنی تعداد میں۔ مگر کسی کو شکوہ ناانصافی کا تو نہیں ہے کسی کو شکوہ زیادتی کا تو نہیں ہے۔

تو یہ...... اب وہ ایک رہبانیت کا نظام ہے۔ میرے نزدیک بھی حضرت عیسیٰ کی تعلیم یہ نہیں تھی۔ مگر اُن کا انفرادی عمل بے شک یہ تھا کہ انہوں نے شادی نہیں کی اور جب شادی نہیں کی۔ تو اُن کے اولاد کہاں ہوگی۔ اُن کا انفرادی عمل ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے۔ اُن کی عمر ہی کیا تھی اس دنیا میں مسلّم بات یہ ہے کہ چالیس برس کی عمر میں وہ اس زمین سے اٹھا لیے گئے۔ بہت کم عمر اُن کی ہوئی چالیس برس کی عمر بہرحال اُتنی عمر میں اُنہوں نے شادی......

شادی نہیں کی۔ انفرادی زندگی گزاری مگر یہ ہمارا اور اُن کا متفقہ ہے کہ اُنہیں بہرحال ایک طرح کی معراج بھی ملی۔ یعنی رفعنہ قرآن میں ہے۔

''میں تمہیں بلند کروں گا اپنی جانب'' تو وہ مسلمان بھی مانتے ہیں اور نصاریٰ بھی مانتے ہیں۔ صرف وہ جماعت جو آپ کے ہاں دائرہ اسلام سے خارج مان لی گئی ہے وہ نہیں مانتی اور باقی نصاریٰ بھی متفق۔ تمام مسلمان بھی متفق۔ یعنی اس غیبت کے نکتے پر تو سب متفق ہیں۔ حالانکہ کوئی حساب لگائے۔ اس غیبت کی عمر کتنی طولانی ہے۔ مگر اس میں عذر نہیں۔ وہ تو جو بات آلِ رسولؐ سے متعلق ہے اس میں عذر ہے۔

بہرحال اُس نظامِ روحانیت والے کی یہ بلندی ہمیں مسلّم ہے ہمیں بھی تسلیم شدہ ہے اور وہ یہ کہ وہ اُٹھالیے گئے آسمان پر...... اِدھر اُدھر نہیں آسمان پر اٹھائے گئے۔ اب جو اس سے برتر نظام کا جو علمبردار ہے اگر اُس کے واقعاتِ حیات میں معراج نہ ہوتی۔ تو اس نظام کی رفعت اُس نظام پر ثابت نہ ہوتی۔ ابھی تک امکان معراج پر ہم تقریر کرتے تھے آج وجوب معراج کو ہم کہہ رہے ہیں کہ ضروری تھی ان کی زندگی میں معراج...... اس لیے کہ اُس نظام روحانیت والا۔ وہ بلند ہو چکا تھا تو اگر معراج نہ ہوتی تو دُنیا کہہ سکتی تھی کہ دیکھو علائق کی گرفتاری کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ان کو معاذ اللہ وہ بلندی نہیں حاصل ہو سکی۔ جو حضرت عیسیٰؑ کو ہوئی۔ اب سائنس والی دُنیا ہم سے لڑے تو ہم کہیں گے کہ جتنے تمہارے اعتراضات ہیں وہ سب درجہ چہارم کے نیچے ہی ہیں اگر معراج عیسیٰؑ تم مانتے ہو۔ تو معراج محمد مصطفیٰؐ میں تمہاری سائنس کیا دخل رکھتی ہے۔

وہ اعتراض ہمیں معلوم ہیں۔ وہ اتنی دور پر جا کے ہوا کا دباؤ ایسا ہو جاتا ہے اور وہ وہاں آکسیجن کم ہو جاتا ہے وہ سب مجھے معلوم ہے لیکن وہ سب درجہ چہارم کے اسی طرف ہیں۔ درجہ چہارم کے آگے نہیں ہیں تو اگر وہ سائنس کے اعتراضات یہاں رُکاوٹ نہیں پیدا کر سکے تو ہم جو کہتے ہیں اس میں بھی رُکاوٹ اس سے کوئی پیدا نہیں ہوگی اور اب مجمل طور

پر کہہ دیا اور کوئی کہے کہ جی وہ تو بچ کے نکل گئے۔ میں کہتا ہوں جناب والا۔ آپ کے اعتراضات سب یہ ہیں کہ کیونکر گئے۔ میں کہتا ہوں قرآن کب کہتا ہے کہ یہ کیونکر گئے۔ کب کہہ رہا ہے قرآن کہ یہ گئے قرآن تو کہہ رہا ہے کہ وہ لے گیا۔ اب اُس کی سب باتوں کو آپ نے سمجھ لیا ہو کہ کیونکر ہوتی ہیں تو اسے بھی سمجھنے کی کوشش کیجئے اور اسی لیے۔ یہ گئے ہوتے تو اب تعریف ان کی ہوتی کہ کتنا بڑا وہ بندہ تھا جو گیا۔ یہاں تعریف تو اس کی ہو رہی ہے۔ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ (سورۂ اسرار:۱) پاک ہے وہ پروردگار جو لے گیا۔ آپ کے کہتے ہیں۔ بشر ہوتے ہوئے کیونکر گئے...... میں کہتا ہوں جی بشر ہوتے ہوئے گئے نہیں۔ وہ خدا ہوتا ہوا لے گیا۔

تو میں کہتا ہوں اُس کے کاموں میں...... کتنا بڑا سائنس دان ہو میں اُس سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے اس کے کاموں کو سمجھ لیا ہے کہ کیونکر ہوتے ہیں مگر کچھ انسان کی طبیعت ایسی ہوگئی کہ جو بات روز کی ہو اُسے نہیں غور کرتا کہ کیونکر اور جو کبھی کبھار سن لی تو لڑنے کیلئے تیار یہ کیونکر۔ آفتاب مشرق سے روز نکلتا ہے کوئی صاحب نہیں سوچتے کیونکر نکلا اور ایک دفعہ سن لیا کہ رسول ﷺ کی دُعا سے ان کے وصی کے لیے مغرب سے نکلا تھا اور لڑنے کے لیے تیار یہ کیونکر؟ میں کہتا ہوں کہ جو روز کی بات ہے۔ وہ آپ بتا دیجئے کیونکر ہوتی ہے تو ایک دفعہ کی میں بتا دوں گا کہ کیونکر ہوئی۔

تو غرض یہ ہے کہ وہ تمام عیسائی دنیا معراج عیسیٰؑ کو مان رہی ہے اور وہ بھی بے دیکھے مان رہی ہے۔ ہم بھی پیش کریں تو ہم سے مشاہدے کے مطالبے کا حق نہیں۔ تو آپ اپنی عقل سے اس کو ہمیں کہاں دکھا سکتے ہیں۔ تو ہم جو کہتے ہیں اُسے آپ دیکھئے مگر ضروریات کی دنیا میں عقائد کی دنیا میں گویا ہمارے رسولؐ کی منزل پیچھے رہ جاتی اور حضرت عیسیٰؑ کی منزل اوپر ہو جاتی ہے اور یہ فقط شخصیتوں کی بات نہ تھی۔ بلکہ یہ نظام پیچھے رہ جاتا اور وہ نظام آگے نکل جاتا۔ یہ عقلی ضرورت تھی معراج کی کہ ہمارے رسولؐ کے واقعاتِ حیات میں

معراج ہو اور وہ اتنے اونچے تک ہو کہ معراج عیسیٰ اُس کی درمیانی منزل ہو جائے وہ درجہ چہارم تک اور یہ آگے بڑھیں تو اتنا آگے بڑھیں تو وہ روحانی مخلوق، یہاں بیوی اور بچوں کا سوال نہیں، وہ لرزے کے ساتھ چھوڑے کہ اب اگر ایک قدم بھی آگے بڑھوں تو نور جلال میرے پروں کو خاک کر دے۔ اب اس بلندی کے نقطے تک گئے ہیں جہاں معراج عیسوی وہ اتنے درجے پیچھے رہ گئی اور وہاں بھی گئے تو نمازیں پڑھاتے ہوئے گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جیسے عرش محل جبروت الٰہی ہوتے ہوئے' فرش (اسکے) حدود سلطنت الٰہی سے خارج نہیں ویسے ہی زمین میرا دار السلطنت ہوتے ہوئے' فلک کی منزلیں میری حدود رسالت سے باہر نہیں۔

اور بس ایک جملہ کہہ کے آگے بڑھوں اور وہ یہ ہے کہ دنیا والوں کہ حیرت اس پر ہے کہ کیونکر ہو آئے۔ بھئی جس کا مرکز یہاں ہو اُس کا وہاں جانا تعجب ہے اور جس کا مرکز ہی وہی ہو۔ اس کا یہاں رہنا تعجب ہے اور جا کے آجانا تعجب ہے۔ اب نظام روحانیت اسلام کی بلندی نمایاں ہوئی اور اسی لیے معراج بھی اُس وقت ہوئی جب پہلے شادی ہو چکی تھی۔ پہلے اولاد ہو چکی تھی۔ یہ دکھلا دیا گیا گویا اسلامی تصور اُس کا۔ رفعت کا درجہ کہ دیکھو بغیر شادی بیاہ کے جو روحانیت کا درجہ ہوتا ہے وہ درجہ چہارم پر اُٹھتا ہے اور جو شادی بیاہ کے علائق کے ساتھ اسیر ہو کر جاتا ہے۔ وہ اتنے اونچے تک جاتا ہے اور اب یہ قرآن کی روایت نہیں ہے یہ منبروں پر آپ کی سنی ہوئی باتیں ہیں۔ جو عرض کر رہا ہوں اور اسی لیے ہو سکتا ہے کہ وہ تواتر کے درجے پر اس طرح پہنچی ہوئی نہ ہوں۔ مگر برابر آپ نے سنا ہو گا وہاں کسی خاص لہجے میں بات ہونا اور وہاں کسی خاص ہاتھ کا' مشابہ ہاتھ کا پردے سے باہر آنا۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں بڑی روح مضمر ہے یہ نظام اسلام کو نباہنا ہے کہ اس منزل پر بھی لا کے ہم نہیں چاہتے کہ وہ محبتیں الگ ہو جائیں۔

نہیں۔ ہم اُن محبتوں کا احترام کرتے ہیں یہاں بھی جو تمہیں آواز سب سے زیادہ

پسند ہے وہی سنوائیں گے۔ جو ہاتھ سب سے زیادہ تمھیں پسند ہیں۔ وہ پسند اسی لیے کہ ہمارا کام اُس ہاتھ سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور اب مجھے بڑی محتاط لفظوں کی ضرورت ہے بظاہر تو اور بہت غلو کی حد میں چلا جانا آسان ہو جائے گا یہاں...... اگر ذرا بے احتیاطی لفظوں کے استعمال میں ہو جائے۔ مگر کیا کروں یہ روایت اگر صحیح ہے۔ میں نے کہا تو اتر سے اس منزل پر نہیں ہے کہ جتنا کہ اکثر ہوتا ہے۔ کوئی اگر کہے کہ فرض کیجئے کہ روایت معتبر نہیں۔ چیز ہے (تو یہ نہ کہہ بیٹھے گا کہ) ایک طرح کا اشکال (انکار) ہو گیا دیکھیے یہ کافر ہو گئے۔

روایات میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن یہ کہ اس روایت کی شکل میں جس سے میں نتیجہ برآمد کر رہا ہوں۔ اُس سے وہ کہتا ہوں کہ ضرورت ہے اس کی وہ چاہے روایتی طور پر...... غلو ہو مگر میں درایتی طور سے مان رہا ہوں کہ اس آواز میں بات ہونا چاہیے تھی اور وہی سا ہاتھ نکلنا چاہیے تھا۔ جو آپ نے سنا ہے وہ بالکل صحیح ہے میرا دل کہتا ہے صحیح ہے چاہے روایتی طور پر صحیح ہو اصطلاحی طور پر نہ ہو۔ صحیح نہ ہو۔ لیکن یہ کہ میرا دل کہتا ہے کہ صحیح ہے..... تو اب جناب والا۔ میں آپ سے عرض کر رہا ہوں۔ ذرا غور فرمائیے کہ یہ ہاتھ بلند ہو رہا ہے اور یہ جناب لہجے میں بات ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ خالق چاہتا ہے کہ وہ محبتیں۔ وہ محبتیں جو وہاں ہیں وہ محبتیں اس بلندی کے خلاف نہیں سمجھتا اس منزل کو منافی مطلب لفی دَنیء صَدَلّی! کے خلاف بھی نہیں سمجھتا تو اب بتائیے جو جزو معراج پیغمبرؐ ہو جائے جن کی الفت' وہ ہمارے لیے اگر جزو دین کے مانند ہو۔ یعنی ان کے لیے وہ معراج تقرب الٰہی تھی تو ہمارے لیے معراج تقرب رسالت مآبؐ نہیں ہے؟

اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہے یعنی...... اسلام کا امتحان یہ نہیں ہے کہ شادی نہ کرو۔ اسلام کا امتحان یہ نہیں ہے کہ بیاہ نہ کرو۔ اولاد نہ ہو۔ نہیں...... دیکھنا یہ ہے کہ شادی ہو۔ مگر بیوی کی محبت فرائض پر غالب نہ آئے۔ اولاد ہو مگر اولاد کی محبت فرائض پر غالب نہ ہو۔ اب ذرا دیکھیے۔ مستند تاریخی حوالوں کا مجموعہ بتاتا ہے کہ ہجرت کے دوسرے ہی سال حضرت

فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی۔ کل اختلاف کے طور پر شادی ہو گئی۔ مگر شادی کی تاریخ، زمانہ...... کسی کے نزدیک کل اختلاف نہیں رہا۔ ہجرت کے دوسرے سال حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی شادی ہوئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنے غزوات اسلامی ہوئے ہیں۔ وہ سب فاطمہ زہرا کی شادی کے بعد ہوئے ہیں۔ اس پہلو پر کہ اور رسولؐ کی بلندی کے دنیا نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ ۲ ہجری سے پہلے تو علی فقط چچازاد بھائی تھے مگر ۲ ہجری کے بعد داماد ہو چکے ہیں اور اب جتنے غزوات اسلامی ہیں۔ وہ سب حضرت فاطمہ زہرا کی شادی کے بعد ہو رہے ہیں۔ وقوع میں آرہے ہیں اور پھر متفقہ علیہ تاریخی بات کہ ہر منزل پر رسولؐ گویا موت کے منہ میں انہیں بھیج رہے ہیں اور ہر منزل پر یہ جا رہے ہیں۔

اب پوری تاریخ اسلام دیکھئے اور بلکہ میں کہتا ہوں حقیقی معنی میں پوری تاریخ اسلام ،کیونکہ اب رسولؐ کے بعد تو مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ اسلام کی تاریخ نہیں ہے اصل تاریخ اسلام یہی ہے تو پوری تاریخ اسلام ہم دیکھ لیں۔ دوسرے بچائے جاتے ہیں نہج البلاغہ کے اس جملے کا حوالہ دے چکا ہوں کہ اصحاب پیچھے رکھے جاتے ہیں عزیز آگے رکھے جاتے ہیں اور ہر منزل پر موت کے منہ میں حضرت علی ابن ابی طالب بھیجے جاتے ہیں تو اب جہاد ان کا ہے مگر رسولؐ کا امتحان کتنا بڑا ہے اور یہ شادی نہ ہوئی ہوتی تو منزل جہاد میں فقط رسولؐ ہوتے اور علیؑ ہوتے۔ دنیا نے کبھی اس پر غور نہیں کیا ہے۔ میں نے خود شاید آج سے پہلے روشنی اس پہلو پہ بیان نہ کی ہو کہ ہر جہاد میں ہمیشہ ہمیں رسولؐ اور علیؑ نظر آئے مگر میں کہتا ہوں کہ کیا فاطمہ زہراؑ کسی جہاد سے غیر متعلق ہیں؟ وہ چاہے اُحد ہو۔ وہ چاہے خندق ہو۔ چاہے خیبر ہو۔ جہاں جہاں علیؑ زخمی ہو کے گرے ہیں کہ ظاہری حیثیت سے۔ اب کھڑے نہیں رہ سکتے۔ جنگ اُحد میں ستر زخم جسم مبارک پہ آئے اور جنگ خندق میں وہ ایک ہزار کے مقابل والا آدمی۔ جس سے دنیا دہل چکی تھی کہ (گھوڑے کا بچہ) اونٹ کا بچہ ہاتھوں میں لے لیا بجائے اس پر کے...... جناتی آدمی...... تو یاد رکھیے ماشاء اللہ پہ گری کا

فن رکھنے والے لوگ بھی سامنے ہیں کہ جتنا ہاتھ قوی ہو گا۔ اتنی ضرب قوی ہو گی۔ تلوار تھوڑی کاٹتی ہے ہاتھ کاٹتا ہے تو ہزار آدمی کے برابر اگر سپاہی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہزار ضربوں کے برابر ضربت ہے اور وہ ضرب سر پر لگتی ہے اور سر مبارک شگافتہ ہو جاتا ہے۔ نتیجے کو نہ دیکھئے یہ دیکھئے کہ ظاہری اسباب تھے۔ جان جانے میں کوئی کمی (کسر) نہیں تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر منزل جس طرح امتحان رسولؐ تھی جس طرح امتحان علیؑ تھی اُسی طرح امتحان فاطمہؑ بھی تھی۔ جس طرح وہ جہاد رسولؐ تھا جس طرح جہاد علیؑ تھا۔ اُسی طرح وہ جہاد فاطمہؑ بھی ہوتا تھا۔

تو...... دنیا والے شادی کو سمجھتے ہیں بس تقریب مسرت اور اب میرے اتنے پورے بیان سے آپ کو واضح ہو گیا ہو گا کہ شادی ہوتی ہے فرائض کا وزن بڑھانے کے لیے۔ عبادت کا وزن شادی سے بڑھتا ہے۔ جہاد کا وزن شادی سے بڑھتا ہے تو یاد رکھیے کہ پھر شہادت کا وزن بھی شادی سے بڑھ جائے گا۔ اس کو تقریب مسرت سمجھ کر بس...... دنیا کہتی ہے کہ جو مصائب کا دن ہو۔ اُس دن شادی کا کیا موقعہ۔ یہ دنیا کا وہی شادی کا تصور ہے جو مادیت کے زیرِ سایہ ہے...... اور اب نام شادی سے بس آپ سمجھ لیتے ہیں کہ بس اب سرمایہ مسرت ہو گئی تو روزِ غم اس کے ذکر کا کیا دخل...... ہاں مجھے احساس ہے کہ آج دیر سے مجلس شروع ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ یہاں کے نظامِ مجلس کے ماتحت اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کو دیر سے شروع کیا جائے مگر اُسی تناسب سے ظاہر ہے کہ وہ بیان اتنا ہی ہو سکے گا کہ وہ زیادہ بے وقت ہو جائے۔ اس لیے اب اس سے آگے نہیں بڑھوں گا۔ کچھ حضرات تو براہ راست واقف ہوں گے اور کچھ سنے سنائے واقف ہوں گے مجھے ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے خاندان میں یہاں اسی کراچی میں ایک سانحہ ایسا ہو گیا کہ مہینہ سوا مہینہ ہوا تھا شادی کو اور اس کے بعد جو داماد تھا وہ بقضائے الٰہی اٹھ گیا۔ تو اب جب اس کا ذکر ہوتا ہے سانحے کا تو اس کے ساتھ شادی کا جز ضرور ہوتا ہے یعنی تذکرہ غم کا جز بن گیا کہتے ہیں کہ

ابھی ایک مہینہ' سوا مہینہ ہوا تھا شادی کو۔ اب اُس مرحوم کے والد ہوں گے وہ بھی اُس کا ذکر کریں گے۔ تذکرہ غم ناواقف یا واقف کار سے اظہار تاثرات کیلئے کہ بھائی ہائے مجھے کیا معلوم تھا۔ ارے ابھی ایک مہینہ تو ہوا ہی تھا اُس کی شادی کو۔ سوا مہینہ تو ہوا ہی تھا شادی کو۔ جو لڑکی والے ہیں۔ لڑکی کے وہاں سے۔ لوگ' وہ بھی اظہار دردمندی میں اظہار غم میں یہی کہیں گے۔ ارے ابھی اس کی شادی کو مہینہ سوا مہینہ ہی ہوا تھا۔

اب اس سے زیادہ ایک دل سوز واقعہ پہلے سے میرا سنا ہوا ہے کچھ لوگوں نے میر تقی میر سے اسے منسوب بھی کیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ واقعی ان کے تذکروں میں ہے یا نہیں۔ بہر حال وہ جس کا بھی ہو۔ درد انگیزی میں شخصیت سے تعارف کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں میر تقی میر ہی کہوں گا خیر پہلی دفعہ جب سنا تھا تو یہی کہ اُن کے تھی کوئی لڑکی اور واقعی وہ واقعہ انہی کے ہاں کا ہے میں نہیں کہہ سکتا۔ تو غرض یہ کہ یہ حکایت میں نے سنی اور ویسے ہی عرض کر دی کہ لڑکی کی شادی ہوئی اور سوچ سوچ کے جو بھی ضروریات زندگی ہوتے ہیں۔ سب جہیز میں فراہم کیے اور سب اتنا اہتمام کیا نہ معلوم برسوں اور اس کے بعد بیاہ کے بھیجا۔ تو اُس زمانے میں پالکیاں ہوتی تھیں۔ تو نکاح ہو گیا اور شادی ہو گئی اور اس کے بعد پالکی سے جب اتارنے لگے تو دیکھا کہ رُوح جسم سے دلہن کے مفارقت کر چکی ہے۔ یعنی آئی تھی وہ دلہن اور نکلی پالکی سے لاش۔ تو دیکھنے والے نے دیکھ کے یہ کہا کہ

خبر کیا تھی ہمیں آرامِ جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تمہیں بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

تو میں نے کہا شخصیت مجھے اگرچہ کسی طور پر معلوم نہیں۔ بہت سے لوگ کو بالکل۔ ان کے لیے یقین ہو کہ نہیں۔ میر تقی میر کا نہیں ہے کسی اور کا ہے۔ کہیں کسی اور کا ہو۔ لیکن یہ کہ وہ جس کا بھی ہو۔ دردناک پہلو وہ ہوتا ہے جو شخصیت سے تعارف کا محتاج نہیں ہوتا۔ جس پر یہ گزری ہو بہر حال وہ گزری۔ اب دیکھیے وہ شادی جزوِ غم ہو گئی یا وہ خوشی کا باعث ہو

گئی اور اب میں نکتہ رس افراد کو بلکہ ترجیح دینے والوں کو متوجہ کروں گا کہ یہ سانحہ ہو مہینہ، سوا مہینے والا یا وہ ہو کہ پالکی سے دلہن اتری تو رُوح نے جسم سے مفارقت کر لی تھی۔ جو بھی ہو...... شادی کے وقت معلوم نہیں تھا کہ یہ ہوگا۔ تو وقتی خوشی تو ہوئی ہوگی۔ بعد میں جزو غم بنی...... یہ دکھلا رہا ہوں میں فرق...... یہاں بھی نہ باپ کو یہ معلوم تھا کہ شادی کے بعد یہ ہو جائے گا۔ نہ لڑکی کے باپ کو۔ نہ لڑکے کے باپ کو...... نہ عزیزوں کو...... کسی کو...... نہ خود دولہا کو...... نہ خود دلہن کو۔ کسی کو یہ خبر نہیں کہ بعد میں یہ ہو جائے گا وہ بعد میں خوشی ناخوشی بن گئی۔ بعد میں شادی ناشادی ہوگئی۔ بعد میں مسرت غم سے بدل گئی۔ اس دلہن کے باپ کو بھی وہ تو جب (گھر سے رخصت کرکے) نکالا تھا اور جب نکاح کیا ہے جب شادی کی ہے اُس وقت تھوڑی خبر تھی کہ یہ ہوگا۔ تو وہاں بھی شادی بروقت تو سبب مسرت ہوتی ہوگی۔

لیکن جہاں دولہا جانے کے لیے تیار ہو مرنے کے واسطے اور معاف کروں گا۔ شعراء سے اور ممکن ہے بعض اہل تحریر کہ وہ تو ہمارے شاعروں نے نجانے کیوں نظم کر دیا ایک رات کی بیاہی اور ایک رات کا دولہا۔ ارے جس روایت پر بنیاد ہے اس میں نہ رات کا ذکر ہے رات کا اُس میں دخل ہی نہیں ہے اصل روایت جو ہے وہ پوری عرض کروں گا کہ رات کا کیا سوال۔ بس جس وقت مرنے جا رہے ہیں تو جس وقت ماں دولہا بنا رہی ہے اُس وقت بھی جانتی ہے کہ جسے دولہا بنا رہی ہوں وہ مرنے جا رہا ہے ارے جس دلہن کے ساتھ نکاح ہو رہا ہے وہ بھی عین اسی وقت یہ سمجھتی ہے کہ وہ میرا شریک حیات ہو رہا ہے جو مرنے جا رہا ہے۔ چچا جو عقد پڑھ رہا ہے وہ بھی یہی جانتا ہے کہ جس کا عقد پڑھ رہا ہوں۔ اُس کو بھیج رہا ہوں اور جو جانے والا ہے وہ بھی جانتا ہے۔

تو ارباب عزا۔ ایک رات کیا۔ ارے تھوڑی دیر کا بھی نہیں...... اور وہ بھی ایک فریضہ اسلامی...... اُس کے ادا کا...... بہر حال اب وہ روایت کو اُس کو ربط کے ساتھ عرض کر رہا ہوں۔ کہ خاندانِ رسالت کا بچہ تھا۔ جانتے تھے کہ کم سنی مانع جہاد ہوتی ہے۔ اس لیے سوچا

کرتے تھے اپنی جگہ کہ کہیں میری کم سنی سدراہ نہ بن جائے۔ اطمینان حاصل کرنے کا محل نہ تھا۔ خلاف بلاغت ہے ایسے تلخ تذکرے کو عرض کرنا خود سے..... شب عاشور امامؑ نے جب وہ خطبہ پڑھا کہ کل روز قربانی ہے اور حضرت ابو الفضل العباسؑ اپنے جذبات کو ظاہر کر چکے اور تمام عزیز..... یعنی طے ہو گیا کہ کوئی جائے گا نہیں۔ ان سب کو قربان ہونا ہے۔ تو اب علی اکبر نہیں کھڑے ہوتے۔ عباس نہیں کھڑے ہوتے۔ کوئی بھی جو حد بلوغ تک پہنچ چکا تھا۔ وہ نہیں کھڑا ہوا مگر قاسم کھڑے ہو گئے۔ اس وقت محل مل گیا مدت سے اپنے تردد کو دور کرنے کا پوچھتے ہیں کیوں چچا۔ کیا ہمارا بھی نام محضر شہادت میں ہے کل یہ شہادت ہمیں بھی نصیب ہو گی۔ بس انہیں بھی سن و سال بچے کا معلوم ہے اس لیے حسینؑ یہ سوال کیے لیتے ہیں کہ دنیا یہ نہ سمجھے کہ بچے نے بے سمجھے کوئی بات کہہ دی۔ مولا پوچھ لیتے ہیں کہ اے بیٹا۔ تمہاری نظر میں موت ہے کیسی چیز؟ اب قاسمؑ جواب دیتے ہیں میں کہتا ہوں کہ جواب مضمون کے لحاظ سے بڑا اونچا ہے لیکن ہر انشاء پرداز' ہر مقرر ہر طریقہ استعمال الفاظ کا جاننے والا' وہ فیصلہ کرے کہ الفاظ قاسم کمسنی کا پتہ دے رہے ہیں۔ کوئی بڑی عمر والا یہ تشبیہ نہیں دے سکتا۔ مولا کہتے ہیں کہ تمہارے نزدیک موت ہے کیسی چیز۔

قاسم کہتے ہیں۔ اے چچا۔ وہ تو شہد سے زیادہ میٹھی چیز ہے شہد سے زیادہ شیریں چیز ہے بس یہ ہے تردد کمسنی کا اور بلاغت یہ ہے کہ جو وجہ تردد ہو اس پر قوی تر مثال پیش کر دی جائے تو اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ کمسنی کی وجہ سے بیٹے کو تردد تھا۔ بھتیجے کو فکر تھا اس لیے مولا نے کہا اے بیٹا ارے کل تو وہ دن ہے۔ تمہارا کیا ذکر۔ تمہارا ننھا بھائی علی اصغر وہ بھی میدانِ قربانی میں نذر حق ہو گا۔

کیونکہ پوری روایت پڑھنا ہے اس لیے اور طاقت سے نہیں پڑھ رہا ہوں۔ تو جناب والا اپنا۔ یعنی جو پہلوئے وجہ تردد تھا اس کی بناء پر تو اطمینان ہوا۔ مولا کے ایسے کہنے سے۔ مگر علی اصغر کا نام سن کے دوسرے رُخ کی طرف ذہن چلا گیا..... تو گھبرا کے کہنے لگے کیوں چچا

یہ اشقیا خیمے میں آجائیں گے ماشا اللہ اجر کم الی اللہ ہر جگہ مجلس کو ختم کر سکتا ہوں مگر مجھے آخر تک جانا ہے فرماتے ہیں نہیں میری زندگی میں نہیں ہوگا یہ تو مجال نہیں ہے اب مجمل طور سے شہادت جناب علی اصغر کا بیان ہوا۔

اس طرح رات کو تو اطمینان حاصل کر لیا۔ مگر صبح جو ہوئی اور اب سلسلہ شہدا شروع ہوا ہو تو جب تک اصحاب جا رہے ہیں تب تک قاسم نہیں کچھ کہتے کیونکہ نظام دیکھ رہے ہیں کہ عزیزوں میں سے کوئی نہیں بھیجا جا رہا ہے معاذ اللہ نادان بچہ تھوڑی ہے نکتہ رس ہے۔ ابھی نہیں کہتا۔ مگر جب عزیزوں کی باری آئی تو جیسے بس اب جلدی ہو گئی سن چکے تھے کہ شہادت مجھے بھی ہوگی۔ تو اب فرزندانِ عقیلؑ جا رہے ہیں یہ کہتے ہیں کہ چچا ہم۔ فرزندان جعفرؑ جا رہے ہیں۔ یہ کہتے ہیں چچا ہم۔ مگر اب جو کہتے ہیں کہ ہم تو حسینؑ یہ نہیں کہتے کہ ابھی نہیں۔ اب جواب دیتے ہیں کہ تمہیں کیونکر بھیجوں۔ تمہیں کس طرح بھیجوں۔ یعنی جیسے قطعی نہ تھا۔ جیسے بچے کے لیے ایک معمہ بن گیا کہ رات کو اطمینان تو دلا چکے تھے۔ مگر اجازت تو دیتے ہی نہیں۔ کروں تو کروں کیا۔

اور اب موقع محل کے خلاف ہے مگر مجھے تو جو اصل حقیقت ہے۔ وہ بھی سمجھانا ہے میری جو سمجھ میں آیا ہے یوں تو امر امام کو امام جانیں۔ مگر جتنا میں سمجھ سکا ہوں وہ جو رات کو اطمینان دلایا تھا۔ وہ تو علم امامت تھا اور یہ آج جو قطعی انکار کر رہے ہیں یہ آئین شریعت ہے۔ کیونکہ شریعت اسلام میں بچہ اپنے نفس کا مالک نہیں ہے۔ جتنے اور ہیں وہ بالغ ہیں۔ یہی ہے جو حد بلوغ تک نہیں پہنچا۔

تو بچہ اپنے نفس کا مالک نہیں ہے۔ ہاں بچے کے نفس کا والی یا اُس کا دادا ہے یا اُس کا باپ۔ یہاں ظاہری نگاہوں کے سامنے نہ دادا ہے نہ باپ ہے۔ ہاں مجھے معلوم ہے۔ جس کا کوئی نہ ہو۔ اس کا ولی امام ہے۔ مگر اہل عزا...... میں کہتا ہوں کہ اختیاراتِ امامت کو تو شب عاشور کا خطبہ پڑھ کے اُٹھا چکے تھے اب کسی کے بارے میں تو اختیار امامت سے کام نہیں

لیتے اور اپنے بے باپ کے بھتیجے کے لیے...... اختیارات امامت سے کام لیں۔اب حسین کیونکر بھیجیں۔آئین شریعت ہے جو سد راہ ہے۔اتنا اصرار کیا اور اتنا انکار سنا اور حیرت ہے کہ انکار کیوں ہے کہ تھک کے بچہ ایک ستونِ خیمہ سے لگ کے بیٹھ گیا۔بس ستونِ خیمہ سے لگ کے جو بیٹھے تو یاد آیا کہ میری ماں نے بتایا تھا کہ باپ نے دُنیا سے جاتے وقت تمہارے ہاتھ پر ایک تعویز باندھا ہے اور یہ کہا ہے کہ جب اِس پر سخت وقت پڑے تو اس تعویز کو پڑھو اور اس پہ عمل کرو۔دل سے پوچھا کہ کیوں قاسم کیا اس سے بڑھ کے کوئی سخت وقت اور ایسا ہوسکتا ہے دل نے کہا نہیں اس سے بڑا سخت وقت نہیں ہوسکتا۔بس یہ محسوس کر کے فوراً تعویز کو کھولا اور اب دیکھا تو اس میں یہ لکھا تھا کہ "اے قاسم تم اس تعویز کو اس وقت کھولو گے" یاد رکھیے اس میں معجزہ ہے اسی لیے جناب سید ہاشم نے لکھا جن کے لیے یہ کتابوں میں ہے کتب اخبار کی کہ علامہ مجلسی کے بعد اتنا بڑا وسیع النظر آدمی نہیں پیدا ہوا انہوں نے سید ہاشم نے مدینۃ المعارج میں جو خاص طور سے انتخاب معجزات معصومینؑ میں ہے۔اس میں اس واقعے کو درج کیا ہے معجزہ امام حسن علیہ السلام کے طور پر کہ تعویز جو کھولا۔تو اس میں لکھا تھا کہ "اے قاسم تم اس تعویز کو اس وقت کھولو گے۔جب تمہارا چچا نرغہ اعداء میں گرفتار ہوگا اور اے قاسم اگر میں ہوتا تو میں اپنے بھائی کی نصرت کرتا۔اب میں تو نہیں ہوں گا میں تمہیں اپنا نائب بناتا ہوں۔تم میری طرف سے میرے بھائی کی نصرت کرنا۔"

بس اب تعویز جو پڑھا تو لیے ہوئے حسینؑ کے پاس آئے اور اب میں کہتا ہوں کہ حسینؑ کے دل کی خبر لیجیے کہ ابھی تک بھیجنے کا حق نہ تھا اور اب روکنے کا حق نہ تھا اور اب روکنے کا حق نہ رہا۔قاسم کو اب کچھ کہنا نہیں تھا۔وہ تعویز یعنی وہ نوشتہ حسینؑ کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا۔بس مولا نے دیکھا اور دیکھ کے...... شیخ مفید کی روایت ہے کہ جیسے بے بسی کا احساس ہے، بھتیجے کو گلے لگا کے اتنا روئے کہ قریباً غش آگیا اور اُسی روایت کا جز ہے کہ جب ذرا سنبھلے، رونے کی شدت میں کمی ہوئی۔تو بس بچے کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا

"یہ تو تمہیں وصیت تھی تم اس پر عمل کرو اور مجھے بھی تو بھائی کی ایک وصیت ہے۔"

اب لیے ہوئے خیمے کے اندر آئے کہاں ہیں زینب کبریٰ" کہاں ہیں بیوہ حسنؑ وہ لباس لاؤ۔

☆......☆......

# مجلس ہشتم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا

(جاثیہ:۱۸)

ترجمہ: ہم نے تم کو دین کے کھلے رستہ پر قائم کر دیا ہے تو اسی رستہ پر چلو جاؤ۔

قانونِ اسلام کے ایک جز پر کل تبصرہ ہوا۔ مگر بعض پہلو ایسے ہیں جو باقی رہ گئے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے...... تو سیرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اہم پہلو ہے اور میں نے کہا کہ اس شعبے میں آ کر جہاں سے آوازِ اعتراض اٹھی ہے وہ براہ راست...... اُس کا نشانہ قانونِ اسلام نہیں تھا۔ بلکہ اصل مقصود سیرت حضرت رسولؐ کو اپنے نقطہ نظر سے داغدار بنانا تھا۔ تو اب اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ میں ہر قدم پر احساس تنگی وقت کا کر رہا ہوں کہ اب تو صرف دو دن رہ گئے ہیں اور انہی میں بس جس حد تک اس موضوع سے متعلق یعنی اصل موضوع شریعت اسلام...... اس کے متعلق جو کچھ عرض کر سکتا ہے وہ عرض ہو سکتا ہے تو اس بنا پر...... بس اس سلسلے میں ایک مختصر جواب جو میں نے ایک غیر کو دیا اور وہ مطمئن ہو گیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں 27 برس میں وہاں رہا۔ اس کے بعد آیا ہوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں...... تو ستائیس برس میں بہت دفعہ اتفاق ہوا۔ امتحانات کی نگرانی کا...... تو اب جن حضرات کو یہ سابقہ پڑا ہو۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ تین گھنٹے گزارنا بہت مشکل ہوتے ہیں۔ جن میں کہ نگرانی کرنا ہوتی ہے یعنی کوئی اور کام اس میں کر ہی نہیں سکتے سوائے نگرانی کے...... یوں بے ضابطہ طور پر کوئی کرے یا آرام بھی کر لے اور سو بھی جائے۔ لیکن یہ کہ قانوناً روا نہیں ہے نظام میں یونیورسٹی کے لحاظ سے...... کہ اس دوران میں کوئی سوا نگرانی

کے اور کام ہو تو وہاں ساتھ ہوتا تھا۔ مختلف شعبوں کے اساتذہ کا تو ہمارے لکھنؤ یونیورسٹی میں جب سے وہ قائم ہوئی ایک شعبہ مشرقیات رہا اور اُس شعبہ مشرقیات میں ایک شعبہ عربی اور فارسی کا اور ایک شعبہ سنسکرت کا..... تو عربی و فارسی کے شعبے میں مولوی آتے تھے اور سنسکرت کے شعبے میں پنڈت حضرات۔ تو اب ایک دفعہ نگرانی میں ایک پنڈت صاحب کا ساتھ ہوا۔ دو آدمی عموماً ہوتے ہیں نگران۔ تو اب وہ اُن سے ملاقات تو ہوتی رہتی تھی۔ صاحب سلامت ہوتی تھی۔ لیکن اطمینان سے کبھی ایسی ملاقات کہ تین گھنٹے گزارنا۔ یہ اُس دن کے پہلے نہیں ہوئی تھی تو اس ذیل میں انہوں نے..... پنڈت صاحب نے کہا اور یہ انداز سے ظاہر ہے کہ واقعی آدمی کو اطمینان حاصل کرنا ہے یا صرف بحث ہی کرنا ہے تو نہیں۔ محسوس ہوتا تھا کہ واقعی ذہن میں اٹکے ایک چیز ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اُس کو صاف کریں۔ تو انہوں نے یہی چیز پیش کی..... کہ حفظ نفس پورا کرنے میں عام افراد کو تو قانون میں کم حق دیا گیا یعنی زیادہ سے زیادہ چار۔ یعنی اب یہاں خود تعدد ازواج مرکز اعتراض نہیں ہے مگر اس کی حد بندی عوام کے لیے گویا..... یعنی افرادِ اُمت لیے چار تک رکھی گئی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا حصہ اس میں زیادہ رکھا تو یہ تفرقہ بندی..... معیار بندی کے خلاف محسوس ہوتا ہے یعنی جتنا دوسروں کو حق دیا گیا تھا۔ اتنا ہی اُس پر عمل کرتے تو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر یہ کہ یہ فرق جو ہو گیا کہ انہیں تو حق چار ہی تک کا اور آپ کے لیے یعنی از روئے قرآن حق جتنا تھا اس کی کوئی حد نہیں۔ مگر بربنائے واقعہ اس کی تعداد نو تک پہنچی۔ تو یہ فرق یہ ایک بلند ذات کے خلاف محسوس ہوتا ہے۔ تو اب میں نے جو جواب دیا...... اور کوئی جواب میں صرف لاجواب بنانے کے لیے نہیں دیا کرتا۔ بلکہ نصب العین یہ ہوتا ہے کہ واقعی خلش جو ہے وہ دُور ہو جائے۔

اب وہ جواب جس بنیاد پر میں نے دیا اور وہ مطمئن ہو گئے۔ جو اُس بنیاد سے متفق نہ ہو۔ پھر اُس سے مطالبہ ہے کہ وہ خود کوئی جواب دے۔ مجھے ضرورت ہوئی کہ انہیں اپنے

یہاں کے فقہ اسلامی کا ایک مسئلہ سمجھاؤں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ عقد کی دو قسمیں ہیں ایک عقد دائمی اور ایک عقد منقطع یعنی معیادی عقد۔ جس کا نام آپ سب...... یعنی مجمع کے افراد جانتے ہونگے۔ تو ایک نکاح دائمی اور ایک نکاح موقت۔ یہ دو قسم کا عقد...... عقد ہے۔ اب جو عرض کر رہا ہوں۔ اُسے یہاں بھی' اور پھر اپنی جگہ صبر و سکون کے لمحات میں بھی غور کر لیجئے گا کہ بنیادی طور پر وہ درست ہے یا نہیں۔ میں نے کہا کہ ہمارے یہاں قانون میں یہ دو عقد ہیں۔ پہلا عقد جو ہے یعنی عقد دائمی اس میں پابندیاں ہیں۔ اُس میں۔ قانون میں بہت سے مطالبے ہیں کہ ان کی پابندی کرو اور دوسرا عقد جو ہے یعنی عقد موقت...... کیونکہ وہ لفظ کچھ لوگوں کے لیے باعث وحشت ہوگا۔ اس لیے نہیں بول رہا ہوں۔ دوسرا عقد جو ہے۔ بہ تعین معیاد اُس میں وہ پابندیاں نہیں ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ پھیلا کے نہیں عرض کرنا ہے۔ اصولی جو اُس کے جز ہیں استدلال کے وہ عرض کر رہا ہوں۔ اب کسی کے اگر نہ سمجھ آئے تو فرصت ہے مجھ سے پوچھ لے۔ لیکن ایک ہے وہ عقد اور ایک ہے یہ...... دو قسمیں ہیں۔ ہمارے نزدیک قانونِ اسلام میں عقد کی اور پہلے عقد میں پابندیاں ہیں۔ دوسرے عقد میں وہ پابندیاں نہیں ہیں اور تعداد جو ہمارے لیے مقرر کی گئی ہے وہ پہلے عقد میں ہے دوسری قسم کے عقد میں کوئی پابندی تعداد کی مقرر نہیں کی گئی ہے بقدر مطالبہ نفس...... یا بقدر ضرورت...... جو دانش مند ہوگا وہ تو بلا ضرورت پانی بھی نہ پیے گا تو تفریط تو وقت ضرورت کے لحاظ سے ہوئی ہے۔ لیکن اُس قسم کا جو عقد ہے اُس میں وہ پابندیاں وہ حدود و قیود نہیں ہیں اور اُس میں کوئی تعداد قانون کی طرف سے مقرر نہیں کی گئی ہے۔ عقل تعداد مقرر کرے اور بات ہے۔ لیکن قانون کی طرف سے اُس میں کوئی قید نہیں ہے تو یہ غلط ہے کہ حفظ نفس میں اپنا درجہ زیادہ رکھا۔ حفظ نفس میں تو ہمیں لامحدود حق دیا اور پابندیوں میں اپنا حصہ زیادہ رکھا۔ اب ظاہر ہے ان سے کہنے میں ذرا کچھ اور آسان لفظیں بنانے کی کوشش کی۔ مگر ایسی بہرحال گفتگو تھی کہ وہ سمجھ گئے اور انہوں نے کہا کہ بالکل میرا اطمینان ہوگیا۔ اگر یہ بات

ہے تو بالکل صحیح ہے کہ حفظ نفس میں حق عوام کو دیا گیا ہے زیادہ...... اور پابندیوں میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ یہ جواب وہی دے سکتا ہے جو ابتداء سے پرسنل لاء کی ترمیم کو نہ قبول کرے۔ ورنہ جو ترمیم وہ جو شروع میں ہو گئی ہے۔ یعنی ایک قسم ہی منسوخ ہو گئی پوری اور وہ ہمارا گویا جرم بن گئی اور بس ایک قسم رہ گئی۔ تو اُس کی بناء پر میرے نزدیک معقولیت کی دُنیا میں کوئی جواب نہیں ہے پھر بحث کرتا ہے۔ تو آپ مقابلے میں وہ سنسکرتی پیش کیجئے اور وہ ان کی گوپیوں کو پیش کیجئے اور وہ سب مناظرانہ انداز ہے اُس سے مخاطب لاجواب ہوتا ہے۔ دل کی تسلی نہیں ہوتی ہے۔ لیکن اگر دل کی تسلی ہو سکتی ہے تو اِسی صورت سے کہ انہیں سمجھایئے کہ جو تم قانونِ اسلام سمجھتے ہو۔ وہ ناقص قانون ہے۔ وہ پورا قانون تم سامنے رکھو تو پتہ چلے گا کہ یہ تمہارا اعتراض صحیح نہیں ہے۔

اب جو میں نے عرض کیا کہ بلا وجہ بلا ضرورت تو کوئی کام نہیں کرنا چاہیے اسے اب یہاں چونکہ کتاب کا نام لے لیا ہے تو مجبوراً مجھے نام لینا ہے کہ ایک میری کتاب ''متعہ اور اسلام'' وہ لکھنؤ کے امامیہ مشن سے بھی دو دفعہ شائع ہوئی ہے اور آپ کے پاکستان کے امامیہ مشن سے بھی دوبارہ شائع ہوئی ہے اور یہ بہرحال تعلّی نہیں ہے مگر یہ کہ میرے علم میں بہرحال اتنا ہی ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں یہاں تک کہ عربی اور فارسی میں بھی اس موضوع پر اتنا مکمل...... اتنی مکمل بحث کہیں نہیں ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے دوست تھے اور بعد میں تو پاکستانی ہو گئے تھے لہٰذا آپ حضرات جانتے ہونگے یعنی جناب نیاز فتح پوری...... اُنہوں نے تبصرہ اُس کتاب پر ''نگار'' میں کیا۔ تو یہ لکھا کہ جس حد تک ایک اسلامی عالم بحث کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ مکمل بحث میں نے کہیں نہیں دیکھی ہے اور بلا شبہ اس کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے اور اپنی جگہ بھی میں نے جہاں تک غور کیا ہے یہی بات ہے کہ بلاشبہ شریعت اسلام میں یہ حکم تھا زمانہ رسولؐ میں اور دوسرا فریق آج تک ثابت نہیں کر سکا ہے کہ کب منسوخ ہوا۔ اب اس کے انہوں نے اپنی آزاد خیالی سے کہا کہ وہ بہرحال وہ تو

صحیح ہے کہ تھا یہ حکم......لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اب موجودہ زمانے میں جبکہ آزادی اپنے تمام جائز حدود سے آگے بڑھ رہی ہے تو اب یہ مناسب ہے اس کا رواج دینا یا نہیں ہے؟

تو اس پر میں نے مختصر تبصرہ یہ کیا۔ پھر کہ اگر آزادی جائز حدود سے بڑھ رہی ہے تو کوشش کرنا چاہیے کہ آزادی کو جائز حدود میں لایا جائے نہ یہ کہ ایک قانون کو منسوخ کر دیا جائے اور یہ تو دُنیا کی ستم ظریفی ہے تعدد ازدواج پر جو اعتراض ہے۔ اُس میں بھی اور اس میں بھی جو اعتراض کیا جاتا ہے اور اعتراض ہی نہیں کیا۔ وہاں تو اقدام بھی کر دیا گیا کہ ایک جز پر تو خط تنسیخ پھیر دیا گیا۔ تو میں اُس دنیا سے جو معترض ہے اس کو اس کے نقطۂ نظر اور اُس کی ذہنیت کو پیش کر کے اور آپ سے فیصلہ چاہتا ہوں کہ ناجائز تعلقات کتنی ہی تعداد میں ہوں۔ کوئی اعتراض نہیں اور کسی قانون میں جرم نہیں۔ وہ جب جبر کی منزل ہو۔ تب جرم بنتا ہے ورنہ بتراضی طرفین (آزاد خیالی) ناجائز تعلقات ہوں تو آجکل کی متمدن دنیا کا کوئی قانون اسے جرم نہیں سمجھتا اور باضابطہ تعدد ازدواج ہو۔ تو اُسے غیر قانونی قرار دے دیتے ہیں۔

بے تحاشہ، بے دھڑک، وقتی طور سے طرح طرح خواہشات نفس کی تکمیل ہو تو وہ جرم نہ ہو اور ایک ضابطے کے تحت میں اگر ہو تو کہہ دیا کہ اس میں اور ناجائز تعلقات میں کیا فرق ہے؟ تو شاید ایک دن کہہ چکا ہوں اور پھر اب یہاں زیادہ وہ منطبق) ہے کہ دائمی تعلقات بھی تو کبھی ناجائز ہوتے ہیں یا اُلٹ کے کہیے کہ ناجائز تعلقات بھی تو کبھی دائمی رہتے ہیں......تو جو فرق ناجائز تعلقات اور نکاح میں ہے۔ وہی فرق عارضی ناجائز تعلقات اور اس عقد منقطع میں ہے۔ تو دائمی اور عارضی ہوئے جواز اور عدم جواز نہیں پیدا ہوتا۔ باضابطہ اور بے ضابطہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔

اب جناب اسی شعبے میں تعدد ازدواج کے۔ وہ ایک سوال جو قبل والے۔ یعنی مرد اور عورت اور حقوق نسواں کی بحث سے بھی متعلق ہے اور اس سے بھی......وہ بھی ایک ایسا ہی

موقع تھا کہ جہاں مطمئن کرتا تھا اور بہت مختصر الفاظ میں یعنی جب تک میرا مستقل تعلق نہیں ہوا تھا۔ مسلم یونیورسٹی سے (میں علی گڑھ ہی میں) وہاں لکھنؤ یونیورسٹی سے ہی متعلق تھا۔ تو میں۔ پہلے پہل تو تیرہ رجب میں جانا ہوا اور اس کے بعد اسلامی ہفتہ۔ وہاں ایک اس زمانے میں ہوتا تھا۔ (دو سال، تین برس) دو برس یا تین برس وہ ہوا۔ تو پھر اس میں بھی میں مدعو ہوا۔ ایک سال اس میں ہمارے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی مدعو تھے اور اس وقت تک وہ ہندوستان میں تھے تو ایک دن اُن کا بیان تھا۔ دوسرے دن میرا تھا۔ اب اُس کی تفصیل نہیں عرض کرنا ہے بہر حال اُس اسلامی ہفتے میں پہلی مرتبہ جب میں گیا تھا اور اُس وقت وہاں اشتراکیت یعنی کمیونزم چھایا ہوا تھا یونیورسٹی پر..... تو دو دن میں سات تقریریں میری ہوئی ہیں۔ جس میں ایک تقریر "کمیونزم اور اسلام" پر تھی اور وہاں ہر تقریر کے بعد حق دیا جاتا ہے سوال کا۔ کہ جس کو اُس تقریر کے متعلق کچھ پوچھنا ہو۔ چنانچہ وہ مجمع اور ظاہر ہے کہ اُس میں اکثریت اُنہی افراد کی تھی۔ جو کمیونزم کے گرویدہ ہیں۔ کیونکہ اُس وقت یونیورسٹی کا ماحول ہی یہی بنا ہوا تھا اور میری تقریر جو ہوئی۔ تو ایک صاحب تھے مصطفیٰ کمال۔ وہ سیکرٹری تھے اُس کے..... اب معلوم نہیں۔ دنیا میں وہ کس جگہ پر ہیں اور ممکن ہے پاکستان ہی میں ہوں بہر حال مصطفیٰ کمال صاحب یہ نام مجھے یاد ہے طلباء میں تھے۔ تو وہ اُس کے روحِ رواں تھے وہ خود اسلامی نقطہ نظر کے تھے۔ تو وہ جب سوالات کا حق ہوا۔ ایک گھنٹہ تقریر ہوئی "کمیونزم اور اسلام" پر اور اس کے بعد سوالات کا مطالبہ ہوا۔ تو ایک سوال بھی نہیں ہوا۔ ایک آدمی نے بھی کچھ نہیں دریافت کیا کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ تب اُنہوں نے بڑے جوش و خروش سے پھر کہا کہ "آج یونیورسٹی سے کمیونزم کا جنازہ نکل گیا۔"

تو خیر..... اُس وقت تو مجھے کوئی جنازہ نکلتے دکھائی نہیں دیا۔ مگر یہ کہ بعد میں ایک حیثیت سے گویا اُن کی بات صحیح نکلی۔ یعنی وہ یونین کے جو الیکشن ہوتے تھے۔ اُس میں یعنی طلباء کی یونین کے الیکشن..... اب بھی ہر سال ہوتے ہیں۔ جس دور میں کہ ایمرجنسی نہ ہو

تب...... عام نظام کے تحت میں ہوا کرتے ہیں الیکشن یونین کے...... تو اس کے پہلے ہر دفعہ وہ یہی افراد منتخب ہوا کرتے تھے۔ وہی صدر۔ وہی سیکرٹری اور وہی جوائنٹ سیکرٹری۔ سب وہی منتخب ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس دفعہ جو الیکشن ہوا تو جتنے اسلام دوست تھے۔ سب آگئے اور اُن میں سے کسی کو اکثریت نہ حاصل ہوئی۔ تو گویا طلباء کی زبان میں تو جنازہ نکل گیا اور وہ تناسب آج تک قائم ہے۔ یعنی جو انقلاب ہوا۔ وہ وقتی نہیں تھا۔ وہ آج تک برقرار رہا۔ تو خیر اُسی میں...... جب چھ تقریریں ہو گئیں تو اب ساتویں عجیب قسم کی وہ محفل مرتب ہوئی۔ اب دیکھ لیا انہوں نے۔ گویا مجھے بھی آزمالیا طلباء نے تو اب یہ اعلان ہوا کہ یہ اس لیے نشست ہے کہ یہاں کسی موضوع پر تقریر نہیں ہوگی۔ بلکہ جس کے ذہن میں کوئی سوال دین کے متعلق ہو اب جناب میں ہوتا تو ڈرتا کہ یہ تو ''سلونی'' ہو گیا۔ مگر وہ مجھ پر ذمہ داری نہیں تھی اُس...... گویا چیلنج کی۔ وہ اُن طلباء ہی نے یہ کہہ دیا کہ یہ اس لیے ہے...... اور مجھے شام کو جانا تھا۔ یعنی گاڑی جاتی تھی دو گھنٹے کے بعد اور اس وقت یہ اجتماع نماز جمعہ کے بعد اُس میں...... یونین ہال ہی میں، تو وہ جو حضرات یونیورسٹی علی گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ یونین ہال کی ساخت انہیں معلوم ہوگی۔ کہ وہاں نیچے گیلریاں ہیں نشست کی اور ایک ڈائس ہے اور اس ڈائس کے اوپر بھی جگہ ہے کہ جب ضرورت ہو تو شرکاء کچھ وہاں بھی بیٹھیں تو وہ نیچے اور اوپر۔ وہ تمام پُر ہو گیا۔

اب ظاہر ہے کہ سوچ سوچ کے لوگ سوالات لائے کیونکہ اعلان ہو چکا تھا کہ اسی مقصد سے یہ اجتماع ہے اور وہ کسی ایک شعبے سے متعلق بھی نہیں، تقریر کے بعد جو مطالبہ ہوتا تھا۔ وہ تو اُسی تقریر سے متعلق جو سوال ہوں اور یہ تو جس کے ذہن میں جو آئے۔ تو وہ جناب سوالات...... اور میں نے یہ طے کر کے جواب دینا شروع کیا کہ کوئی سوال، کسی کا جواب دو چار منٹ سے زیادہ نہ ہو۔ کیونکہ میری گاڑی چھوٹنے والی تھی۔ تو خیر وہ منزل آئی کہ اب پرابند ہو گیا اور وہ اب کوئی سوال نہیں ہوتا اور اب میرا وقت بھی قریب روانگی کے...... کہ

ایک دفعہ اوپر سے یہ سوال ہوا۔ یہی کہ مردوں کو تو چار تک کا حق دیا گیا اور عورتوں کو ایک سے زیادہ کا نہیں حق دیا گیا۔ یہ کتنی بڑی گویا قانونِ اسلام میں ناانصافی ہے تو اب میں نے اُس مجمعے کو جو میرے سامنے تھے مخاطب کر کے کہا۔ میں اُدھر دیکھ کے کیا کہتا تو اپنے سامنے کے مجمع کو مخاطب کر کے میں نے کہا کہ یہ جو عالم بالا سے سوال نازل ہوا ہے تو اس کے بارے میں مجھے بس یہ کہنا ہے کہ اسلام میں یہ شادی یا رشتہ ازدواج صرف حظ نفس کی تکمیل کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ مفاد بقائے نسل انسانی کی خاطر ہے اور مرد کئی شادیاں کرے تو اس مفاد کو مدد پہنچتی ہے لیکن عورت جتنی چاہے شادیاں کر لے اس مفاد کو کوئی تقویت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ وہ اب سب خاموش ہو گئے۔ جواب ہو گیا بلکہ وہ جو اظہارِ مسرت کا طریقہ ہے' آپ کو معلوم ہے' وہ بھی ہو گیا اور اب میں نے کہا کہ بس اب میں جاتا ہوں چنانچہ اسٹیشن چلا گیا تو وہ آخری بات تھی۔ اس لیے وہ مجھے یاد بھی رہ گئی اور وہ میرے موضوع سے بھی متعلق ہے بس جناب اب زیادہ تمہید میں طول نہیں دوں گا کیونکہ تاریخ کے تقاضے سے جو حال بیان کرنا ہے۔ اس میں زیادہ اختصار سے کام نہیں لینا ہے۔

تو میں کہتا ہوں کہ ہماری تاریخ بھی نمایاں کر رہی ہے کہ شادی کن کن مقاصد سے ہوا کرتی ہے اسلام میں...... فقط حظ نفس کی تکمیل کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ بہت سے اُس میں بلند مقاصد مضمر ہوتے ہیں۔ اب بلا فاصلہ آپ کے ذہن کو منتقل کر دوں کہ امیر المومنین علیہ السلام نے جو جناب ام البنینؑ سے عقد فرمایا۔ اُس کا پس منظر آپ کو معلوم ہے اور جناب زہیر ابن قین نے یعنی اتنا...... حالانکہ یہ بھی تاریخ کی حقیقت ہے بہت سے لوگوں کو معلوم ہے کہ زہیر ابن قین دوستانِ اہل بیتؑ کی جماعت میں نہ تھے یہ اس وقت تک بحیثیت جماعت غیروں میں شامل تھے۔ مگر روایت کا تواتر اتنا بڑا تھا کہ دوسرے حلقوں تک بھی پہنچا ہوا تھا۔ مسلم ابن عوسجہ اگر یہ بات کہتے تو یہ پہلو نمایاں نہ ہوتا۔ حبیب ابن مظاہر یہ گفتگو کرتے تو یہ پہلو نمایاں نہ ہوتا۔ تو اب جناب زہیر ابن قین معاف فرمائیں کہ یہ لوگ یہ گفتگو

کر ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے کہ یہ عباسؑ کو پہچانتے تھے۔ مگر یہ جناب زہیر ابن قین...... چونکہ نووارد تھے۔ تو اُنہوں نے روز عاشور حضرت ابوالفضل العباس سے کہا کہ مجھے آپ کو ایک واقعہ یاد دلانا ہے اور آپ نے ارشاد فرمایا۔ بتاؤ کیا واقعہ ہے اور اُس وقت جناب زہیر ابن قین نے کہا کہ جب حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے آپ کی والدہ گرامی سے عقد فرمایا ہے۔ تو آپ کو اُس کا پس منظر معلوم ہے؟ وہ ظاہر ہے کہ سب کو معلوم ہے انہیں معلوم نہ ہوتا۔ مگر یہ اخلاق آلِ رسولؑ ہے۔ فرمایا نہیں بتاؤ۔ جو کہنا ہے وہ کہو۔ تو انہوں نے کہا۔ حضور جب انہوں نے عقد فرمانا چاہا حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے بعد۔ تو انہوں نے آپ کے چچا جناب عقیلؑ کو بلایا تھا۔

دیکھئے اب بعض چیزیں، پہلے کبھی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اب ضرورت ہو جاتی ہے کہ وہ علم امامت کو اگر بیچ میں لائیے گا۔ تو کوئی تاریخ واقعہ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ روزمرہ کا نظام حیات علم امامت و نبوت پر مبنی نہیں ہوتا۔ اس لیے ظاہری ذرائع کو صرف کیا جاتا تھا تو جناب عقیلؑ کو بلایا، آپ کے چچا کو اور ان سے فرمایا آپ انساب عرب واقف ہیں۔ کسی بہادر قبیلے کا پتہ دیجئے۔ کیوں۔ اس لیے کہ حسینؑ تو رسولؐ کا فرزند ہے میں چاہتا ہوں، میرا کوئی بیٹا ہو۔ جو وقت آنے پر فرزند رسولؐ پر قربان ہو۔ یہ امیر المومنینؑ نے فرمایا تو جناب عقیلؑ نے آپ کو ننھیال کا پتہ دیا اور کہا کہ وہ قبیلہ۔ بڑے بڑے بہادر اس میں پیدا ہوئے ہیں اور وہاں انہوں نے بتایا کہ ایک لڑکی ہے اور وہ زیادہ موزوں ہے۔ آپؑ اس سے عقد فرمایئے۔ تو ان کے مشورے سے، اس مقصد سے آپ کی والدہ گرامی کے ساتھ امیر المومنینؑ نے عقد فرمایا "بس یہ تو بربنائے اخلاق واقعہ پورا ان کی زبان سے سن لیا۔ جو ان کے گھر کی بات تھی۔ لہٰذا کتنی دفعہ انہوں نے سنا ہوگا۔ بلکہ خود ماں نے بیان کیا ہوگا۔ یہ تو اخلاق تھے کہ سن لیا۔ مگر جب سن لیا تو پھر تاب نہ رہی اور آپ کو معلوم ہے۔ سنتے آرہے ہیں کہ رکابوں پر زور دے کے ایک انگڑائی لی شیر کی طرح اور یہ کہا اَتُشَجِّعُونِی یَا زُهَیر "اے

زہیر تم مجھے شجاعت دلاتے ہو۔'' تو اب آپ دیکھئے یہ شادی کیا ہے...... تمہید قربانی ہے یعنی یہ نکاح کیا گیا ہے بغرضِ قربانی علی چاہتے ہیں کہ میری شرکت واقعہ کربلا میں ہو اور وہ ہم ہی کو نہیں سکھایا گیا کہ تم تمنا کرو یا لَیْتَنَا کُنَّا مَعَکُم '' کاش ہم آپ کے ساتھ ہوتے اور اُس عظیم کامیابی کو حاصل کرتے۔'' اسی کو اکثر اُن لوگوں کے جواب میں کہتا ہوں جو ہمارے گریے پر معترض ہیں طرح طرح کے زخموں سے طرح طرح سے ہمارے گریے پر اعتراض ہوتا ہے۔ تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گریہ جو ہے وہ بزدلی ہے یا عورتوں کا کام ہے رونا...... بہادروں کا کام رونا تھوڑی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ذرا سمجھ کے بات کیجئے۔ کسی خطرے میں ہو کر رونا بزدلی ہے اور کسی اہم معرکے میں شرکت نہ کرنے پر رونا...... یہ بزدلی نہیں ہے۔ ہم زیر رایت ابوالفضل العباسؑ ہوتے تو نہ روتے کربلا میں کیا حبیبؓ ابن مظاہر روتے ہوئے گئے۔ کیا مسلمؓ ابن عوسجہ روتے ہوئے گئے۔ کیا زہیرؓ ابن قین روتے ہوئے گئے۔ اصحاب میں سے کون تھا جو روتا ہوا دنیا سے گیا۔ ارے قاسم بھی اس وقت تک روئے۔ جب تک اجازت نہیں ملی۔ تو کربلا میں کون روتا ہوا گیا۔

ہاں وہ ظاہر ہے کہ مصائب وہ پڑھنا نہیں ہیں۔ جو پڑھنا ہے وہ آپ کو تو معلوم ہی ہیں۔ مگر میں عرض کرتا ہوں قاسم نہیں روتے ہوئے گئے۔ عباسؑ روتے ہوئے نہیں گئے۔ علی اکبر روتے ہوئے نہیں گئے۔ مگر زین العابدینؑ عمر بھر روئے۔

ماشاءاللہ بے تاب ہو گئے آپ۔ اجرکم الی اللہ۔ تو اب آپ رونے کا پس منظر سمجھے۔

تو اب ابوالفضل العباسؑ نے کہہ دیا کہ اے زہیر...... دیکھنا کل...... ایسی تلوار ہو گی۔ عرض کروں گا یہاں یہی محاورہ۔ ایسی جنگ کروں گا کہ دنیا یاد رکھے گی۔ خدا کی قسم۔ ولولہ ان کی شجاعت کا یہی تھا۔ اب کیا کروں کہ روزِ عاشور حکم امام کے تحت شجاعت کے ولولے بھی نثار کر دیے گئے اور اسی لیے میں عام تصور کے خلاف کہتا ہوں کہ وفائے عباسؑ وہ نہیں ہے۔

جو میدان جنگ میں ہوئی۔ وفائے عباسؑ وہ تھی۔ جو میدان میں جانے سے پہلے دکھائی۔

عباسؑ کے دل میں دل ڈال کے دیکھئے کہ اصحاب چلے جائیں اور عباسؑ رہ جائیں اور عباسؑ کی زبان میں عرض کروں کہ بچپن کا ساتھی حبیبؑ اُس بڑھاپے میں جان قربان کر دے اور عباسؑ۔ جو اپنے کو غلام کہتا ہے۔ وہ زندہ سلامت رہے۔ یہ عباسؑ کے لیے ہر قدم پر ایک قربانی تھی اور خیر جب تک اصحاب تھے اس وقت تک تو خیر...... لیکن جب گود کے پالوں کی باری آئی تو عونؑ و محمدؑ چلے جائیں اور عباسؑ زندہ رہیں اور فرزندان عقیلؑ چلے جائیں اور عباس صحیح سلامت کھڑے رہیں اور سب سے بڑھ کے یہ کہ ارے بھائی حسنؑ کی یادگار...... وہ تلواروں سے ٹکڑے ہو جائے اور عباس...... مگر وہ تو جس وقت علم ملا۔ اُسی وقت سمجھ لیے کہ اب مجھے تو یہ داغ سب اٹھانا ہیں۔ یہ علم نہیں ہے۔ میرے پیروں میں زنجیریں ہیں جذبات شجاعت...... یہ جھتنے ہیں۔ بخدا علم کے احترام پر قربان ہوئے ہیں اور اسی لیے تو تمام سامانِ عزا حسینؑ کی طرف منسوب مگر علم جو ہے وہ عباسؑ کا ہے...... اور مصائب میں تمہید کوئی کہنا' اصولِ ذاکری کے خلاف مگر میں اُس رسمی اصول کا پابندی نہیں ہوں۔ میں کہتا ہوں یاد رکھیے کہ ہمیں مثالیں معلوم ہیں کہ صفت اور موصوف میں تعلق ایسا ہوتا ہے کہ ایک سے ذہن دوسرے کی طرف منتقل ہو۔

نوشیرواں کی لفظ کہی جائے۔ تو ذہن میں عدالت آئے گی حاتم کی لفظ کہی جائے تو ذہن میں سخاوت آئے گی۔ مگر میں جو فرق ہے وہ آپ کے سامنے عرض کروں اور ذہن منتقل کروں کہ حاتم کا نام سن کر سخاوت ذہن میں آئے گی۔ لیکن سخی کی لفظ سے حاتم سمجھ میں نہیں آئے گا۔ نوشیرواں کی لفظ سے عدالت سمجھ میں آئے گی۔ مگر عادل کی لفظ سن کے نوشیرواں ذہن میں آئے یہ نہیں ہے۔ یعنی موصوف میں صفت نمایاں ہوئی ہے۔ صفت میں موصوف کا جلوہ نہیں آیا ہے۔

لیکن یہ مخصوص وہ ہیں کہ یہاں صفتیں کہیے موصوف کا نام لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ

شروع ہوا ہے رسولؐ اللہ کے وقت سے۔ امین کہا رسولؐ سمجھ میں آئے۔ صادق کہا رسولؐ سمجھ میں آئے۔ وہ مشرکین عرب کو نام لینے کی ضرورت نہ تھی صفتیں تھیں جو موصوف کی طرف ذہن منتقل کر رہی تھیں۔ اسی طرح اب بات پہنچی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام تک تو یہاں یہ نہیں ہے کہ نام سے صفتیں سمجھ میں آئیں۔ مشکل کشاء کہا تو علی سمجھ میں آگئے۔ فاتح خیبر کہا تو علی سمجھ میں آئے۔ مولودِ کعبہ کہا تو علی سمجھ میں آئے۔ سابق الایمان کہا تو علی سمجھ میں آئے یعنی صفتیں موصوف سے ایسی مختص ہوئیں۔ مگر بس اتنا ہی اصول ذاکری کے خلاف تھا۔ اب ذہن آپ کا فوراً موڑ دوں کہ فاتح خیبر کہہ کے علی سمجھ میں آئیں گے ارے ساقی کوثر کہہ کے علی سمجھ میں آئیں گے مشکل کشاء کہہ کے علی سمجھ میں آئیں گے مگر علمدار کہہ کر علی سمجھ میں نہیں آئیں گے عباسؑ سمجھ میں آئیں گے۔

ایسی علمداری تھی۔ خیبر کا علم...... ہر میدان جنگ میں ہر اہم میدان میں علم اُن کے ہاتھ میں اور اتنا ہی نہیں متفق علیہ حدیث رسولؐ کی کہ دنیا ہی میں علمدار نہیں آخرت میں بھی یہ علمدار۔ رسولؐ نے فرمادیا کہ:

تم میرے علمدار ہو...... دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی...... اتنی بے نظیر علمداری...... اور جناب جعفرؑ طیار...... ان کی علمداری۔ وہ بھی اسی شان کی ہے۔ داہنا ہاتھ کٹ گیا۔ علم کو گرنے نہیں دیا۔ بایاں ہاتھ کٹ گیا علم کو گرنے نہیں دیا۔ انہوں نے بھی آخر دم تک علم کو سنبھالا ان کی علمداری بھی بے نظیر۔ مگر کیا کروں کہ علمدار کہہ کے نہ جعفرؑ طیار سمجھ میں آتے ہیں۔ نہ حیدرؑ کرار سمجھ میں آتے ہیں۔

علمدار کہہ کے تو بس عباسؑ وفا شعار...... ماشاءاللہ آپ تو چاہتے ہونگے۔ مصائب میں بہرحال زیادہ وقت صرف کروں تب بھی آپ کے لیے کم ہی ہے کیونکہ ہر غم سے آدمی گھبرا جاتا ہے۔ مگر یہ غم حسینؑ کوئی فطرت کی تشنگی ہے۔ جس پیاس کو یہ بجھایا کرتا ہے۔ دُنیا اندازہ نہیں کرسکتی۔ اُس نعمت کا...... جو غم حسینؑ کی شکل میں ہم کو ملی ہے۔

تو ارباب عزا...... بہر حال اختصار مصائب میں نہیں ہو رہا ہے مگر یہ ممکن ہے آپ کا ذوق عزا اس سے بھی زیادہ طلب گار ہو۔

بہر حال ابھی مجھے اسی دائرے...... ہمارے والد ماجد فرمایا کرتے تھے اور وہ بھی اپنے دور میں بڑے کامیاب ذاکر تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ابو الفضل العباس کا حال پڑھنے کے لیے قوت چاہیے تو ظاہر ہے کہ میرا تقاضہ عمر وہ نہیں ہے۔ میرا اندازہ وہ نہیں ہے اس لیے جس شان سے جو حق ادا ہونا چاہیے وہ حق تو ادا نہیں ہو سکتا۔ مگر ارباب عزا...... یہ جذبات علم پر قربان ہو رہے ہیں۔

جب تک اصحاب جا رہے تھے تو اُس وقت تو ایک دفعہ بھی نہیں کہا۔ کیونکہ خاندانِ رسالت کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ علیؑ ایسے فصیح و بلیغ کے بیٹے تھے۔ تو بے محل ہے ابھی...... کوئی عزیز نہیں جا رہا ہے۔ نظام یہ مقرر ہوا ہے کہ اصحاب پہلے چلے جائیں تو عباس کیونکر کہیں۔ مگر جب عزیزوں کی باری آئی تو فرزندانِ مسلم جانا چاہتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ مولا مجھے اجازت دیجئے اور مولا بالکل باضابطہ جواب دیتے ہیں کہ تم تو علمدار ہو...... لیجئے فرزندانِ مسلم کے لاشے آگئے اور عباسؑ علمدار ہونے کی وجہ سے کھڑے رہے اور اب کہہ رہے ہیں۔ جب فرزندانِ جعفر آ رہے ہیں۔ تو فرزندان جعفر ہیں۔ ارے زینبؑ کے فرزند ہیں۔ وہ دونوں ہوں یا ایک ہوں۔ مگر جب فاطمہؑ زہرا حسینؑ اور عباس میں فرق نہیں سمجھتیں۔ تو زینب دو بیٹوں میں جبکہ کردار ایک ہی ہے کیونکر فرق سمجھیں گی۔ لہٰذا زینب کے فرزند جا رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں...... "مولا ہم"...... فرمایا "نہیں تم تو علمدار ہو۔"

ہر دفعہ کہا اور چپ ہو رہے۔ لیکن جب قاسم کی لاش آگئی۔ تو اب فقط یہ نہیں کہا کہ ہم۔ اب اس کے ساتھ تمہیدی الفاظ ہیں۔ جو پوری وارداتِ قلب عباسؑ کو نمایاں کرتے ہیں اور جلالت عباسؑ سد راہ ہے۔ انتخاب الفاظ بہت مشکل ہے۔ مگر کیا کروں کہ اصل حقیقت مجھے یوں سمجھ میں آ رہی ہے کہ مجھے تو الفاظ عباس ایسے محسوس ہوتے ہیں کہ جیسے کوئی سپاہی

اپنے سردار کے سامنے آ کے ہتھیار چھوڑ کے رکھ دے جیسے اظہار عاجزی۔

سینے گا الفاظ...... عباسؑ کہتے ہیں کہ اے مولا۔ اب تو داغ اٹھاتے اٹھاتے عباس کا سینہ تنگی کرنے لگا ہے۔ صاف ظاہر ہے یعنی مولا۔ اب بس کی بات نہیں ہے اور بس پھر بارگاہ عباس میں عفو کی درخواست انہی کی بارگاہ میں پیش کروں گا۔ میں خود حضرت ابوالفضل العباسؑ کو مخاطب کر کے کہتا ہوں۔ جو آپ کے لیے دفتر مصیبت ہے۔ میں کہتا ہوں۔ اے میرے آقا...... اے میرے شہزادے۔ اے میرے مولا اے ابوالفضل العباس۔ بے شک بڑا صبر کیا۔ بے شک بڑی برداشت سے کام لیا۔ مگر بس آپ عباسؑ ہیں اور یہ حسینؑ آپ بھی چلے جائیے۔ یہ آپ کا داغ بھی اٹھا لیں گے۔ مگر اب مولا کیا فرماتے ہیں۔ پہلے تو وہی باضابطہ جملہ کہا قانونی گویا...... کہ بھائی بس یہ خیال تھا کہ تم علمدار ہو۔ مگر اب عباس خاموش نہیں ہوئے۔ عرض کیا۔ مولا اب وہ لشکر کہاں رہا جس کا میں علمدار ہوں۔

اب گویا مولا کے پاس جواب نہ تھا۔ اب فرماتے ہیں کہ "بھائی جاتے ہو تو پھر اب بھتیجی کے لیے پانی کی فکر کرو۔" اور ماشاءاللہ آپ نکتہ رساں ہیں۔ میں کہتا ہوں حسینؑ کے نام کا پانی ہر جگہ رکھا جاتا ہے اور ہر مذہب وملت کے لوگ پیتے ہیں جہاں جہاں وہ پانی رکھا جائے اس کا نام "سبیل" ہے۔ تو مولا نے عباس سے یہی کہا ہے کہ اے بھائی جاتے ہو تو پانی کی کوئی سبیل کرو۔ آج ہم گویا اپنے عمل سے کہتے ہیں کہ اے مولا۔ اُس دن تو سبیل نہ ہو سکی۔ آج ہر جگہ آپ کے نام پر ہر مذہب کے پیاسوں کے لیے سبیلیں موجود ہیں۔

اب فرما رہے ہیں...... پانی کی سبیل کرو...... اس کے معنی یہ ہیں کہ پھر ذمہ داری ایک سپرد کر دی...... اب عباس کا نصب العین لڑنا نہ رہا...... پانی کا لانا رہا...... مگر یہ تو حکم امام کو فرمانِ الٰہی سمجھتے ہیں اس لیے تیزی سے خیمے میں گئے۔

بس اب زیادہ طول دینا میری طاقت سے باہر ہے کہ گئے اور کہا، سکینہ کہاں ہے۔ دیکھیے بچی کا دل کتنا بڑھ گیا۔ ارے فوراً آئی۔ فرماتے ہیں' بیٹی اپنی مشک لے آؤ...... اچھی

مشک لے آؤ...... ارے سکینہؑ۔ کیا بتانے کی بات ہے کہ کتنی تیز رفتاری سے گئیں۔ جتنی ممکن طاقت تھی اتنی تیز رفتاری سے گئیں اور دل کتنا بڑھ گیا کہ چچا نے خود مشک مانگی ہے اور لا کے مشک دے دی۔

بس اب سال گزشتہ اسے درمیان میں کہا ہوگا۔ آج اس جز کو آخر میں کہتا ہوں کہ ہمارے ہاں بحمد اللہ ہر گھر میں عزاخانہ ہے تو مجھے لکھنؤ کا حال معلوم ہے۔ یہاں بھی وہی رسوم عزا ہیں۔ کہ کچھ علم تو انتیس ذالحجہ سے لگ جاتے ہیں جب عزاخانہ مرتب ہوتا ہے اور ایک علم ہے جو خاص آٹھ محرم کو یوں تو سب علم نسبت حضرت عباسؑ کی طرف رکھتے ہیں۔ مگر یہ علم خاص حضرت عباس کا علم کہلاتا ہے اور یہ علم ضریح کے پہلو میں ایستادہ کر دیا جاتا ہے جتنے اور علم ہوتے ہیں اس میں فقط پٹکا ہوتا ہے۔ مگر یہ علم جس کا نام ہے حضرت عباس کا علم...... جو آٹھ کو نصب ہوتا ہے۔ اس میں پٹکے کے پہلو میں پنجے کے پاس ایک مشک بھی ہوتی ہے۔ بس اس نے میرے ذہن کو منتقل کیا ایک حقیقت کی طرف۔ جسے تاریخ نے نہیں بتایا ہے راویوں نے نہیں بتایا ہے کہ یہ منظر ہمیں ایک واقعے کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے کہ اب سکینہ نے لا کے جو مشک دی تو صاف تھا کہ دوسرا فریضہ حذف ہو گیا۔ لہٰذا یہ علم کو گوشے میں کھڑا کر دیتے۔ علم کو...... زیادہ احتیاط تھی تو ثانی زہرا کے ہاتھ میں دے دیتے کہ آپ علم کو سنبھالے رہیے میں پانی لینے جاتا ہوں۔ مگر یہ تو اُسے عطیہ مولا سمجھتے ہیں اور اس مشک کو بھتیجی کا عطیہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا نہ علم کو ہاتھ سے دیتے ہیں۔ نہ مشک لینے سے انکار کرتے ہیں۔ مگر مشک کو لیتے ہیں تو اُسی علم میں پنجے کے پاس، پھریرے کے ساتھ۔ اسے بھی آویزاں کر دیتے ہیں۔

گویا یہی نقشہ جو ہمارے سامنے ہے یہی عباسؑ کے علم کا تھا اور یہ ہے شجاعت عباسؑ کوئی اور ہوتا۔ تو مقصد کو چھپاتا فوج سے۔ یہ ان کی بہادری ہے کہ انہوں نے مشک بھی علم بنا دیا اور گویا پوری تیس ہزار فوج کو مخاطب کر کے کہہ دیا کہ دیکھو میں اس مشک کو لیجاؤں گا اور

میں اسے دریا سے بھروں گا۔ اب اگر مجال ہو تو آ کے روکو۔

بس اب چند جملے کہ: اب یہ تو فرات گواہی دے گا کہ وہ روک سکے یا نہیں ارے دریا تک پہنچے اور پانی بھرا اور پھر نکلے اور پانی بھری مشک کو علم کے ساتھ لیکے چلے۔ بس اب آخر میں یہی کہ آپ چشم دل سے دیکھئے کہ کیا جب سے عباسؑ گئے ہیں بچے خیموں کے اندر بیٹھے ہیں؟ یقیناً بچے خیمے کے دروازے پر ہیں اور نظریں علم پر ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ علم دریا کی طرف بڑھ رہا ہے اور پھر اس کے بعد علم دیکھا کہ خیمے کی طرف آ رہا ہے اُدھر علم بڑھ رہا ہے اور پھر اس کے بعد علم دیکھا کہ خیمے کی طرف آ رہا ہے اُدھر علم بڑھ رہا ہے۔ ادھر ان کا دل بڑھ رہا ہے۔ بس ایک دفعہ علم جھکا۔ سکینہ کا دل ہلا۔

شیر نے بائیں بازو پر علم کو لے لیا اور پھر ایک دفعہ علم جھکا اور پھر سنبھلا آپ نے علم کو سنبھال لیا۔

بس ارباب عزا......

ایک دفعہ علم جھکا...... حسینؑ نے کمر تھامی...... سکینہ نے دل تھاما......

ارے میرے چچا...... ارے میرے چچا۔

......☆......

# مجلس نہم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا

(جاثیہ:۱۸)

ترجمہ: ہم نے تم کو دین کے کھلے رستہ پر قائم کر دیا ہے تو اسی رستہ پر چلو جاؤ۔

ظاہر ہے کہ بس آج ہی کا دن ہے اور اس لیے اب موقع نہیں کہ اور تفصیلات کو عرض کیا جائے اور آج کے دن تو کچھ زمانے سے اب ایسا ہوا ہے۔ وہ بہت میرے خیال میں تیں چالیس برس سے تبدیلی ہوئی ہے کہ آج کے دن بھی بیان ہونے لگا ہے۔ ورنہ ہماری زندگی کے کافی حصوں تک اور شاید ہم سے چھوٹے افراد بھی جو سن پیری تک پہنچ چکے ہیں۔ اُن کے شباب تک یہ مشاہدہ تھا کہ آج کے دن صرف مصائب بیان ہوتے تھے اور مجمع بھی اس کا طلبگار نہیں ہوتا تھا کہ آج کے دن کچھ اور بیان بھی ہو۔ لیکن ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ ذوق میں تبدیلی ہوئی ہے کہ لوگ بھی گویا سننا چاہتے ہیں اور مضامین بھی...... اور بیان کرنے والے بھی پھر بیان کرتے ہیں اس لیے حقیقت میں تو آج کچھ ذہن کا لگاؤ تمہیدی بیانات کے ساتھ نہیں ہوتا۔

مگر ایک جز جو میں نے ایک دن اشارتاً کہا تھا۔ آج صراحتاً عرض کر رہا ہوں، چاہے زیادہ تفصیل کے ساتھ نہ ہو۔ کہ آج کی دنیا میں بھی جو مطالبہ ہے شریعت اسلام میں تبدیلیوں کا...... وہ صرف بعد والے فقہ کے ابواب میں ہے جو میں نے شاید دوسری تاریخ کی مجلس میں اقسام بیان کیے تھے کہ عبادات ہیں اور عقود ہیں اور ایقاعات ہیں اور احکام ہیں تو آج جو دنیائے تمدن و تہذیب یا مغرب زدہ دنیا کا مطالبہ بھی ہے وہ صرف بعد کے شعبوں

کے کچھ حصوں میں تبدیلیوں کا ہے۔ مثلاً ''عقود'' میں نکاح کا باب۔ اس میں کچھ ترقی یافتہ ذوق کے تقاضے ہیں کہ کچھ تبدیلیاں کی جائیں۔ جیسے کہ ''تعدد ازواج'' ہے یہ عقود کے باب سے متعلق ہے یا طلاق کے سلسلے میں یہ کہ وہ مرد صاحب اختیار ہے اور عورت صاحب اختیار نہیں ہے۔ یہاں مطالبہ ترقی پسندانہ یہی ہے کہ نہیں۔ اس میں دونوں کو برابر سے اختیار ہونا چاہیے۔ تو یہ کہاں......؟ دوسرے شعبے سے یعنی ''ایقاعات'' سے متعلق ہے یہ مطالبہ ترمیم......اور اسی طرح اس کے بعد میراث میں مثلاً وہی پوتے مجوب ہونے کا مسئلہ......یہ میری بیان کردہ تقسیم کے لحاظ سے آخری شعبے سے آخری قسم سے متعلق ہے یعنی احکام سے متعلق ہے۔ وہ نہ عبادات ہیں نہ عقود ہیں۔ نہ ایقاعات ہیں......وہ شعبہ احکام کا ہے۔ وہاں یہ مطالبہ......

لیکن آج کی متمدن دنیا میں۔ کوئی عبادات کے حصے کو نہیں چھو رہا ہے۔ عبادات کے بارے میں۔ جو جیسی نماز صحیح جانتا ہے۔ وہی پڑھے۔ جو جس طرح روزہ رکھتا ہے۔ اُسی طرح روزہ رکھے۔ حج کو جاتا ہے تو جو اس کے نزدیک جس طرح حج ہونا چاہیے۔ اُسی طرح حج کرے۔ عبادات کے معاملے میں کوئی مطالبہ کسی یگانہ یا بیگانہ اپنے اور پرائے کسی کا مطالبہ نہیں۔ یعنی اس کو حق نہ ہونا۔ یہ مسلم ہو گیا ہے کہ اقتدار دنیا کو اس میں مداخلت کا حق نہیں ہے، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ارباب اقتدار نے اپنا حق سمجھا کہ ان چیزوں میں بھی مداخلت ہو اور اقتدار کا طلسم یہ ہے کہ بحمد للہ مسلمانوں کے گروہ نے جمہوری حیثیت سے اسے تسلیم کر لیا اور اگر تسلیم نہ کیا ہوتا۔ تو وہ تبدیلیاں آج تک نافذ کیوں رہتیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حق مداخلت ارباب اقتدار کا تسلیم کر لیا نظام عبادات میں اور اس کے لیے اکثر تو اختلافی خارداروں سے ہٹ کے کسی متفق علیہ نقطے تک پہنچتا ہوں جسے ہر ایک ماننے کیلئے تیار ہو۔ میں کہتا ہوں کہ وہ ''مختلف فیہ'' ہے کہ اصل کیا تھا۔ مگر تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ تو کئی طرح کی نماز ہے کیوں...... جیسے قرآن مجید میں ایک روادارانہ اعلان کیا ہے کافروں کے مقابلے

میں وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (سبا۔۲۴)

ارے بھئی لمحہ فکریہ ہے..... اپنی جگہ سوچو..... یا تو ہم ہدایت پر ہیں یا تم تو اُس کا نتیجہ کیا ہے کہ دوسرا گمراہی پر ہے۔ یا وہ دوسرا ہدایت پر ہے تو ہم گمراہی پر ہیں..... عدل گفتگو قرآن کا دیکھئے کہ بے محابہ دوسرے کی طرف گمراہی کی نسبت نہیں دیتا۔ اُن کے ضمیر پر فیصلہ چھوڑ رہا ہے کہ بھئی یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ حق دو متضاد سمتوں میں ہو۔ ہم توحید کے علمبردار۔ تم شرک کے علمبردار..... تو تم خود اپنی جگہ غور کرو کہ کون ہدایت پر ہے اور کون گمراہی پر۔

تو اب بس۔ جب قرآن کی یہ آیت میں نے پڑھ دی تو اب میں نہیں ڈرتا کہ کوئی کہے کہ انہوں نے منبر پر حقانیت کو مشکوک بنا دیا۔ میں دنیا سے کہتا ہوں کہ میں یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہتا ہوں اس وقت، کم سے کم اس منبر پر..... کہ اصل نظامِ شریعت اسلام کیا تھا۔ لیکن اسے دنیا غور کرے کہ جب کئی طریقے ہیں نماز کے..... تو رسولؐ نے تو ایک ہی طریقے سے پڑھی ہوگی۔ تو مسلمان کے لیے تلاش جستجو کا جذبہ تو پیدا ہونا چاہیے کہ وہ اصل کیا تھی جس میں یا اُس نے تبدیلی کی یا ہم نے تبدیلی کی اور میں کہتا ہوں یا ہم نے تبدیلی کی یا آپ نے تبدیلی کی۔ بہر حال ہمیں بھی سوچنا ہے کہ کس نے تبدیلی کی..... آپ کو بھی سوچنا ہے..... سوچنا چاہیے..... ضمیر کے فیصلے پر کہ کس نے تبدیلی کی..... اب آپ زباں بندی نہ کیجئے کہ اُس زمانے کی باتوں کو اب کیوں سوچیں۔ ارے اُس زمانے کی بات تھی جب تک تاریخ رہتی اور جب عمل کی منزل آگئی۔ تو ہمارے دور کی بات ہوگئی۔

اور اب..... میں نے تو عرض کیا ہے اور وعدہ کر لیا ہے کہ منبر پر یہ نہیں طے کروں گا کہ وہ اصل کیا تھی؟ اور تبدیلی کا مرتکب کون ہے؟ تبدیلی کس نے کی ہے؟ یہی ہے تلخ گوشہ۔ یہی ہے ذرا آبگینہ ہائے خاطر کو ٹھیس لگانے کا..... تو میں وعدہ کرتا ہوں میں اس کو منبر پر طے نہیں کروں گا۔ میں کہتا ہوں کہ اپنی جگہ فرصت کے لمحات میں سوچئے تو..... کہ اصل کیا تھی..... اُس گمشدہ اصل کو ڈھونڈیئے اگر نماز پڑھنا ہے..... اور اگر مسلمان رہنا

ہے۔ تو اُس گمشدہ اصل کو ڈھونڈیئے۔ بس ایک آپ کے سوچنے کی مہم میں آسانی کے لیے ایک اصول پیش کروں۔ اُس پر بھی غور کر لیجئے گا کہ صحیح ہے یا نہیں کہ رسولؐ کے عمل کو گھر والے زیادہ جانتے ہونگے یا باہر والے۔

اب یہاں پر بھی میں ہر حقیقت کو اگر...... اگر کہہ کے کہہ رہا ہوں...... تاکہ میری طرف سے مسلط نہ کیا جائے...... کوئی فیصلہ...... بلکہ ہر ایک اپنی جگہ خود غور کرے...... اُس کی تحقیق کے اوپر چھوڑ رہا ہوں کہ میں کہتا ہوں کہ یہ اصول سمجھ لیجئے کہ رسولؐ کے عمل کو گھر والے زیادہ سمجھیں گے یا باہر والے...... اب اگر نظر آئے کہ باہر والوں میں خود اختلاف ہے اور گھر والے سب ایک نکتے پر متفق ہیں۔ صلوٰۃ بھیجیے بلند آواز سے (پہلے نعرہ تکبیر...... نعرہ رسالت...... نعرہ حیدری حسینیت) اب ایک آخر میں رہ گیا نعرہ صلوٰۃ پھر بلند آواز سے صلوٰۃ اور یاد رکھیے جتنے نعرے پہلے لگائے۔ وہ سب ہم نے لگائے اس میں خدا شریک نہیں تھا۔ مگر یہ صلوٰۃ وہ ہے جس میں اللہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہے۔

تو حضورِ والا یہ فرصت کے لمحات میں دیکھئے کہ کہیں پر تو تبدیلی ہوئی ہے۔ تو آج جہاں دنیا ہمت نہیں کر رہی ہے۔ اتنی ہمتیں ایک وقت میں کی گئیں...... اور کامیاب ہوئیں ہمتیں...... اور دنیا میں چل گئی وہ ہمت...... اور دنیا والے بہر حال' کوئی نہ کوئی طبقہ اُس پر عمل کر رہا ہے...... اور اب نماز ایسی خالص عبادت، اور ایسی کہ اِنْ قُبِلَتْ قُبِلَتْ مَا سِوَاهَا وَاِنْ رُدَّتْ رُدَّتْ مَا سِوَاهَا۔

اگر یہ قبول تو سب اعمال قبول اور اگر یہ رد تو سب اعمال رد۔ اور اس میں دیکھئے کہ کہیں پر تو تبدیلی ہوئی ہے کہ کوئی ہر سورہ کو بسم اللہ کے ساتھ پڑھ رہا ہے اور کوئی بغیر بسم اللہ کے پڑھ رہا ہے اور کتابی صورت میں تو شاید فقط "جہر" میں اختلاف ہو۔ تو کوئی اگر اخفاتی نماز بھی ہے تو بسم اللہ کو "جہر" کے ساتھ کہہ رہا ہے اور کوئی اگر جہری نماز بھی ہے تو بسم اللہ کے ساتھ جہر نہیں کرتا۔ مگر جہر ہی کیا نہیں کرتا' وہ آہستہ بھی کب پڑھتا ہے۔ ورنہ آہستہ سے بھی

پڑھتا تو کچھ وقت تو صرف ہوتا۔ چپکے سے پڑھنے میں بھی تو کچھ وقت صرف ہوتا ہے۔ تو ہر ایک کا احساس ہوگا کہ بس اللہ اکبر کے بعد بلا فاصلہ الحمدللہ رب العالمین۔ اور اب یہ استدلال کوئی نہیں ہے بلکہ خود میں صاف کردوں کہ یہ منبری بات ہے جو عرض کر رہا ہوں کہ یہ آخر بسم اللہ میں کیا تھا۔ کہیں اس نقطے ہی سے تو ضد نہیں ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ وہی جن کے گھر کی بات تھی' وہ سب متفق بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور وہ بھی جہر کے ساتھ...... اور اب جہاں اختلاف نظر آرہا ہے۔ اُس میں بھی دیکھتے ہیں کہ امام شافعی جو ایک فقہ کے مقتدا ہیں وہ اہل بیت رسولؐ کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ کفیکم مِنْ عظیم الْفَضْلِ اِنَّکُمْ۔ مَنْ لَمْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ لَا صَلَاۃَ لَہٗ۔ وہ ایک دوسرے باب سے متعلق ہے۔ بھولے سے میں نے ابھی شروع کر دیا۔ وہ ایک دوسرے باب سے متعلق ہے۔ وہ بھولے سے میں نے ابھی شروع کر دیا...... تشبیہ میں صلوٰۃ...... ایسی بھولیں دلیل عدم عصمت ہوتی ہیں۔ تو جناب وہ بسم اللہ کی ابھی بات تھی۔ بہرحال یہ صلوٰۃ کی آگئی کہ اب امام شافعی کہہ رہے ہیں اہل بیت رسولؐ کو مخاطب کر کے۔ اے اہل بیت رسولؐ آپ کی فضیلت کے لے یہ کافی ہے کہ جو آپ پر درود نہ بھیجے اُس کی نماز ہی نہیں ہو گی۔

اور بسم اللہ کے بارے میں تو وہ ایک بیان کر چکا ہوں کہ جب وہ مسجد میں آئے امیر شام تو انہوں نے پہلی دفعہ بسم اللہ نہیں کہی تو مسجد سے صحابہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سَرَقْتَ آیَۃً مِنَ الْقُرْآنِ کہ آپ نے قرآن کی آیت ایک چرالی اور اب یہ مسلم بہت بڑے عالم اکثریت کے طبقے کے ہیں۔ وہ علامہ نیشاپوری تفسیر میں بھی لکھ رہے ہیں۔ علامہ رازی تفسیر میں بھی اس واقعے کو درج کر رہے ہیں۔ مگر مسلمانوں میں عمل اُسی پر ہے جس کے متعلق معلوم ہے کہ چوری تھی۔

اب یہ طلسم اقتدار ہے' یعنی میں کہتا ہوں کہ علماء پر اس طلسم کا اثر کم تھا' عوام پر زیادہ

تھا...... علماء نے اکثر انصاف پسندی سے کام لے کے حقیقتیں درج کر دی ہیں۔ مگر عوام پر ایسا طلسم اقتدار چھا گیا تھا کہ جیسے اکثر علما کو بھی بے بس بنا دیا تھا اور جس نے ذرا کھل کر کہنا چاہا۔ اُسے سزا ملی۔ صحاح ستہ کے مصنفین میں امام نسائی اور فضائل علی ابن ابی طالب میں کتاب لکھ دی تو حلب میں جا کے اس کی اشاعت جب کی تو پسلیاں توڑ دی گئیں۔ یہ صحاح ستہ کے مصنفین پر گزری فضائل اہل بیتؑ کے درج کرنے پر...... تو عوام پر اقتدار کا اثر اتنا علماء بے بس، امام شافعی عمر بھر پریشان رہے کہ مجھ پر الزام یہ لگتا ہے کہ آپ ہمارے مسلک سے الگ ہیں اور اسی طرح سے آپ کا مشاہدہ ہوگا کہ کچھ حق پسند افراد، جو کبھی کبھی حق گوئی سے کام لیا۔ تو وہ ہمیشہ مورد الزام و اعتراض رہا اور مجبوراً اکثر قدم پیچھے ہٹانا پڑا۔ تو جب قدم پیچھے ہٹا لیا ہو تو سمجھ لیجیے کہ ضمیر کا فیصلہ وہی پہلا تھا اور یہ مصالح وقت کا تقاضہ تھا، جو قدم پیچھے ہٹایا جا رہا ہے۔

تو اب علامہ ابن حجر مکی، یہ بھی وہ ہیں جنہوں نے ''ردّ شیعہ'' میں ایک نہایت سخت کتاب لکھی ہے ''صواعق محرقہ'' اور وہ لکھتے ہیں ''منہ بکیہ'' میں کہ یہ اتنی کد ''بسم اللہ'' کے خلاف اس لیے ہوگئی کہ علی ابن ابی طالب زور دیتے تھے بسم اللہ کے بالجبر کہنے پر، لہٰذا تقاضائے سیاست ہو گیا کہ پوری طاقت اُس کے خلاف صرف کر دی جائے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عبادات کا شعبہ بھی تابع سیاست بن گیا۔

اور اذان یہ بھی جز و واجب نہ سہی۔ مگر کمال عبادت اُس سے وابستہ ہے ''تاکیدی استحباب'' اور اقامت اُس سے زیادہ تاکیدی چیز۔ بعض علما وجوب کے قائل ہیں اقامت میں۔ اسی لیے اذان زیادہ تر اُسی وقت ہوگی کہ جب جماعت ہو۔ یعنی تاکید اُسی وقت ہے۔ یوں فرادہ میں بھی آپ اذان کہہ لیا کریں تو ثواب ہوگا۔ مگر زیادہ اُس پر عمل اُسی وقت ہے جب جماعت ہو۔ لیکن اقامت جو تنہا نماز پڑھے گا۔ وہ بھی اقامت کہہ لے گا۔ اگر بہت غیر معمولی تعجیل نہیں ہے، جلدی نہیں ہے۔ تو اقامت مثل واجب۔ اُس کی پابندی ہوتی

ہے۔ تو اب یہ ایک طرح کا عبادت کا جزیہ بھی ہے۔ لیکن وہ آنکھوں سے دیکھنے کا ہے کہ اذان میں فرق ہے یا نہیں۔ وہ ہر ایک ہر مسجد میں جا کر دیکھ سکتا ہے کہ اقامت میں فرق ہے یا نہیں...... اب کس کس بنا پر یہ فرق ہوا۔ وہ جزوتاریخ ہے۔ میں نے ایک دن کی مجلس میں عرض کیا تھا کہ ہمیں ہر ابتداء ہر تبدیلی کی تاریخ معلوم ہے اور ہمیں اب براہ راست کیونکر معلوم ہوتی انہیں مورخین کی بدولت' ہمیں ابتدائی تاریخیں معلوم ہیں کہ کس وقت سے کون ابتداء شروع ہوئی۔ تو جس وقت میں کہ جہاد پر زور تھا۔ جس وقت میں کہ فتوحات ہو رہے تھے۔ تو اس وقت مفاد اسلامی سے بخیال خود کہا گیا کہ بھئی اس وقت ہم مسلمانوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں۔ ہم سمجھانا چاہتے ہیں مسلمانوں کو کہ جہاد خیر العمل ہے۔ لہٰذا نماز میں یہ نہ کہا کرو۔ کیونکہ اس سے ذہنیت اسلامی کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے نقطہ نظر سے...... یعنی وہ سمجھ لے گا کہ بس نماز پڑھ لی تو خیر العمل ہو گیا اور ہمارا مطلب ہے یہ سمجھانا...... تو اب میں ہر ایک مسلمان سے انصاف کے ساتھ کہوں گا کہ ہمارا مطلب زیادہ عزیز ہے یا اللہ کا مطلب۔ اب اللہ کا مطلب تو یہی تھا کہ نماز خیر العمل ہے۔ ہم اگر یہ مطلب سمجھائیں کہ نہیں یہ خیر العمل ہے تو گویا ہمارا مطلب ٹکرا رہا ہے اللہ کے مطلب سے تو گویا معاذ اللہ اس نے بے سمجھے اسے جزر کھ دیا تھا...... تو یہ تبدیلی نیک نیتی کے ساتھ' مفاد اسلامی کے لحاظ سے نجیال خود اس کی قائم کی گئی۔ تبدیلی کی گئی۔ جو آج تک چل رہی ہے۔ اب وہ جسے تبدیل کیا گیا تھا۔ وہ آج تک نہیں۔

یعنی کاش دنیا اسی پر غور کرتی کہ جو تبدیلی اُس وقت ہوئی۔ وہ اُس وقت بہت مناسب ہوئی۔ لیکن جب وہ وقت نکل گیا۔ تو اب جو اصل تھا اُسے پلٹاؤ۔ شریعت اسلام کے احکام کو کہتے ہیں کہ وہ وقتی مصالح تھے اور جو تبدیلیاں وقتی مصالح سے ہوئی ہیں' وہ دائمی وجود رکھتی ہیں وہ ہمیشہ کے لیے برقرار۔

تو یہ ہو رہا تھا اور برابر اُس میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ کوئی خط فاصل

ایسا کھنچے جس میں سیاست کا اثر کم سے کم ہو حق پرست ایک جماعت اس اکثریت سے دور ہو اور شریعت کا وقار ایسا ہو جائے۔ تو کم سے کم اب کوئی تبدیلی نہ ہو۔ یہ کام حسینؑ نے انجام دیا اور اس لیے میں کوئی بھولے سے نہیں کہہ رہا ہوں شعوری طور پر کہہ رہا ہوں کہ کارنامہ کربلا اصولِ دین کی خاطر نہیں ہوا تھا شرک نہیں پھیل رہا تھا۔ کھلم کھلا۔ پردے میں تھا تو رسولؐ کے وقت بھی وہ رہا پردے میں۔ اس وقت بھی مسجدیں آباد تھیں اس وقت بھی خانہ کعبہ کا حج ہوتا تھا۔ مگر اصل کیا تھا...... کہ شریعت اسلام میں تبدیلیاں برابر ہو رہی تھیں۔ اس لیے آئندہ کیلئے سدباب کی ضرورت تھی اور یزید نے طلب بیعت کر کے حسینؑ کو اس مہم کی تکمیل کا موقع دے دیا۔

اگر وہ طلب بیعت نہ کرتا تو اب بھی یہ نجانے کب تک خاموش رہتے اور میں کہتا ہوں کہ آخر ۶۰ھ تک بھی تو یہ برابر ہو رہا تھا مگر کوئی کھڑا نہ ہوا۔ تو حسینؑ کا کارنامہ تو صرف انکار بیعت ہے اور جب مطالبہ بیعت ہوا۔ تو انہوں نے انکار کیا۔ اگر مطالبہ بیعت ہوتا ہی نہ تو اقرار و انکار پردے میں رہتا۔ پھر قلم لوگوں کے ہاتھ میں ہوتے۔ کسی کو کہہ دیتے کہ چھ مہینے کے بعد بیعت کر لی کسی کو کہہ دیتے کہ جب صلح کی تو بیعت کر لی ان کے لیے بھی کچھ کہہ دیتے۔ خدا کی قسم۔ اُس نے اصرار کر کے انہیں انکار کا موقع دے دیا۔ دنیا والوں نے بھی تو اصرار کیا ہی نہیں اور کبھی غلط فہمی سے اصرار کیا...... تو تھوڑے دن اصرار کیا اور بعد میں دیکھا کہ جب انکار ہے تو خطرناک سمجھے اصرار کو کہ پھر انکار جز و تاریخ بن جائے گا...... تو یہ یزید کی تعریف ہو رہی ہے؟ میں کہتا ہوں خدا کی قسم فرعون نہ ہوتا...... تو موسویت پردے میں رہ جاتی...... نمرود نہ ہوتا تو ابراہیمیت پردے میں رہ جاتی...... تو اُسی طرح یزید نہ ہوتا تو حسینیتؑ پردے میں رہ جاتی...... نہ وہ فرعون کی تعریف ہے نہ وہ نمرود کی تعریف ہے اور اسی طرح یہ یزید کی تعریف نہیں ہے...... میں کہتا ہوں اُس نے نادانستہ کشاں کشاں حسینؑ کو تاریخی شخصیت کے منظر پر لا کے کھڑا کر دیا ورنہ ان میں سے کربلا کے افراد میں سے کون

ہے جو آج دنیا میں آیا ہو۔ پچاس برس عباسؑ بھی عباسؑ تھے۔ یعنی جتنی اُن کی عمر تھی۔ پچاس برس پورے تو ان کی عمر نہیں تھی۔ بتیس برس ان کی عمر تھی۔ تو اُس کے پہلے عباسؑ بھی عباس تھے۔ مگر تاریخ میں کوئی نام نہیں۔ اُس کے پہلے علی اکبر بھی علیؑ اکبر تھے۔ مگر تاریخ میں کوئی نام نہیں اور بلاشبہ حسینؑ تو پورے پچاس برس کے تھے۔ وہ تو ستاون برس اُن کی عمر ہے کربلا میں۔ مگر یہ کہ ۶۰ھ سے پہلے رسولؐ کے بعد پچاس برس حضرت امام حسین علیہ السلام کی تاریخ میں کوئی شخصیت نمایاں نہیں۔ اگر کوئی جمع کرنا چاہے حالات کو قبل کربلا کے...... تو چند ورق سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ تو گم ہیں نہ شخصیتیں۔

بخدا یہ کربلا کی دین ہے کہ ہمیں حسینؑ کا پتہ چلا۔ کربلا کی دین ہے کہ ہمیں علیؑ اکبر کا پتہ چلا۔ کربلا کی دین ہے کہ عباسؑ کا پتہ چلا۔ تو یہ یزید نے طلب بیعت کر کے حقیقت میں ان کے انکار کو تاریخی بنا دیا اور اسی لیے کربلا کی ضرورت تھی۔ مکے میں یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ حاجیوں کے بھیس میں قاتل آ گئے تھے۔ اب اگر وہاں قربانی ہو بھی جاتی۔ تو قاتل روپوش ہو جاتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فرزند رسولؐ کی جان بھی گئی اور قاتل بانقاب ہی رہا۔ حسینؑ نے کہا کہ حاجیوں کے بھیس میں آئے ہوئے قاتلوں کے ہاتھ سے قتل نہیں ہوں گا۔ نہیں...... آفتاب نیم روز کی روشنی میں قاتل نظر آئے۔ اب کوئی مشتبہ نہ بنا سکے قاتل کو اس کے لیے کربلا کے میدان کی ضرورت تھی۔ ورنہ ان کے لیے جان دینا کعبے میں بھی ویسا ہی تھا۔ جیسے کربلا میں۔ اب جان دے کے تو ان کے بعد کربلا بھی کعبہ بن گیا۔

مگر بخدا جو مقصد کربلا تھا۔ وہ مکے میں پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ قاتل روپوش ہو جاتا۔ لہٰذا حسینؑ نے مدینے سے آ کے مکے میں پناہ لی اور اب مکے میں جب حاجیوں کے لباس میں قاتل آئے۔ تو جذبہ عبادت کو جو حج ہے۔ قربان کر دیا مقصد کربلا کی خاطر یہ نئی قسم کی قربانی ہے کہ حج کو دو دن رہیں اور جو پاپیادہ روایت میں ہے کہ پچیس حج جس نے پاپیادہ کیے ہوں...... پاپیادہ...... وہ دو دن رہیں تاریخ حج میں اور نکل کھڑا ہو...... تو یہ کیوں نکل

رہے ہیں؟ مجھے غیر کا کوئی جملہ بھی اگر وہ خاص ندرت رکھتا ہے تو میں انصاف کے خلاف سمجھتا ہوں اُس کا نام نہ لینا، وہی حسین ڈے لاہور والا...... جس کے لیے میں اپنی تقریر کا کوئی حصہ پیش کر چکا تھا۔ مگر اُس تقریر...... اُس حسین ڈے میں پنڈت ویاس مصرا کا ایک جملہ مجھے یاد رہ گیا کہ جب اس مضمون کو ادا کرتا ہوں تو اُس جملے کو اُس کے کہنے والے کے حوالے کے ساتھ کہتا ہوں۔ مدینے سے مکے آئے۔ اب یہ تو تاریخی حقیقت ہے اس میں مذہب وملت کا سوال نہیں اور مکہ سے اب کربلا کے لیے جا رہے ہیں تو یہاں کتنا حسین خوبصورت اور معنی خیز جملہ۔ ویاس مصرا نے کہا ہے وہ اب چیف جسٹس ہیں دہلی میں کہ یہ سفر جو ہیں۔ مقتل کی تلاش میں ہیں۔ کسی کا حصہ ہو جاتا ہے کوئی جملہ کہ یہ سفر نہیں ہے۔ حسین کو مقتل کی تلاش ہے اور اب میں واقعے سے مطابق کروں تو غور کیجیے گا۔ تو وہ مقتل مل گیا دوسری محرم کو۔ جبھی حسینؑ نے جب نام پوچھ لیا۔ کربلا۔ تو کہا۔ ھاھنا واللہ

یہ دوسری محرم کو یہیں پر ختم کی تھی مجلس کہ:

یہاں بخدا ہمارے خیمے نصب ہوں گے...... یہاں بخدا ہمارے سامان رکھے جائیں گے...... یہاں ہمارے خون بہائے جائیں گے...... یہاں ہماری ہتک حرمت ہوگی۔

جیسے تلاش تھی اس سرزمین کی...... وہ کربلا کا مقتل...... وہ حسین کو مل گیا۔

مگر ارباب عزا۔ اب...... ابھی ایک دم سے کربلا تھوڑی ہو جائے گی...... ہاں ہے کربلا۔ مگر جو کربلا کا آخری امتیازی نقطہ وہ تو رفتہ رفتہ سامنے آئے گا۔ لیجیے چوتھی محرم کو خط گیا ابن سعد کا۔ ابھی سعد کہاں۔ حر کا خط گیا۔ چھٹی محرم کو ابن سعد فوج لے کر کربلا میں آگیا۔ اور اہل عزا ساتویں محرم سے پانی بند ہو گیا...... اب میں کہتا ہوں کربلا کربلا بن رہی ہے...... ابھی تک کہاں کربلا ہے...... ساتویں محرم سے پانی بند ہو گیا...... اب چھوٹے چھوٹے بچے خالی کوزے ہاتھوں میں لیے ہوئے صدائے العطش بلند کر رہے ہیں۔

اور اب آج کی تاریخ آئی تو محرم کی۔ تو آج کی خصوصیت کربلا کی...... اب کربلا نمایاں تر ہوتی جارہی ہے کہ اب آج تو محرم کو امام نے فرمایا۔ تاسوعا یوما 9 محرم کی تاریخ وہ ہے کہ حسینؑ چاروں طرف سے گھر گئے ہیں۔ معصومؑ کا کلام ہے۔ مگر اس کی تشریح میں عرض کروں گا تھوڑی دیر میں۔

کہ تو محرم کو مولا چاروں طرف سے گھر گئے اور اب تاریخ کی آپ کو خصوصیت بتا دوں کہ چھ محرم کو تو جو آیا تھا اس کا نام ہے عمر ابن سعد اور نو محرم وہ ہے کہ سہ پہر کو شمر آ گیا۔ بس اب میں نے عرض کیا آج نصب العین ہی مصائب ہیں۔ وہ تو ضرورتاً میں نے کچھ تمہید میں عرض کر دیا کہ آج سہ پہر کو شمر آ گیا اور شمر کے آنے تک صلح کی گفتگو جاری تھی۔ مولا نے ابن سعد سے گفتگو کی تھی اور اس نے اطلاع دی تھی۔ مولاؑ نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ مجھے ملک چھوڑ دینے دو۔ کہیں دُور چلا جاؤں۔ اُس کہیں اور کے لیے تاریخ میں اتنا ہی ہے۔ مگر ہمارے ہاں روایت مشہور ہے کہ مولا نے فرمایا تھا کہ مجھے ہندوستان چلا جانے دو۔ اُس وقت کا ہندوستان غیر منقسم ہندوستان تھا۔ وہ پاکستان اُس سے الگ نہیں ہے ارشاد فرمایا تھا۔ مجھے ہندوستان چلا جانے دو...... اور اس سے مراد وہاں کے مشترک جلسوں میں اور وہاں کے مشترک جلسے اس کے معنی یہ ہیں۔ اُس میں غیر مسلم بھی ہیں۔ تو اس مشہور روایت سے میں وہاں کام لیتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک وقت میں ہندوستان میں ایسا امن تھا کہ جسے عراق میں امن نہیں ملتا تھا وہ ہندوستان آنا چاہتا تھا۔ تو اب ہندوستان کے ہر فرد کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کو اس معیار پر پہنچائے جو امام کی توقعات کے مطابق ہے۔ تو بہر حال میں نے اشارتاً کہہ دیا تھا کہ تاریخ میں یہ جز نہیں ہے۔ یہ مشہور روایت جو ہم نے سنی ہے سینہ بہ سینہ وہ ہے۔ تاریخ میں تو یہ ہے کہ کہیں دور و دراز جگہ مجھے چلا جانے دو۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ وہ تو میں نے کہا کہ اس وقت ہندوستان کے معنی ہیں پر امن جگہ...... تو حسینؑ...... شاید فرمایا ہو۔ یہ روایت کچھ دل کو لگتی ہے کہ حسینؑ تو نہ آئے مگر غم حسینؑ آ گیا۔

مگر خدا کی قسم...... ہندوستان والوں نے جس جس طرح سے غم حسین تازہ کرنے کی صورتیں سوچی ہیں وہ خود عراق میں بھی نہیں ہیں جیسے جذبہ بے قرار ہے کہ کس طرح غم حسین کے تقاضے پورے ہوں۔ اس لیے یہ گزری ہوگی ہر ایک کے دل پر...... اب تو زیارات کا دروازہ تقریباً بند ہے مدت سے مگر جب یہ سعادت ہر ایک کو حاصل ہو سکتی تھی...... تو بہت سے ایسے ہونگے...... جنہوں نے یہ سعادت حاصل کی ہو...... کچھ نے ممکن ہے...... اب بھی حاصل کی ہو کسی ذریعے سے جو آجکل کی صورتیں ہیں کہ جناب چاہے عراق میں ہوں اور چاہے ایران میں...... جب محرم آجائے گا۔ تو ہر ایک کا دل چاہتا ہے کہ اپنے وطن میں ہو۔ یعنی تسلی غم حسینؑ کے اظہار کی...... کہیں کا کیا ذکر...... خود کربلا میں نہیں ہوتی اور اسے ہمارے بزرگوں نے ایک تذکرہ سنایا ہے کہ کسی موقعے پر کسی کو اہل کربلا میں سے اس کا احساس ہوا کہ جو رونق کربلا میں غیر زمانہ محرم میں ہوتی ہے...... وہ زمانہ محرم میں نہیں ہوتی...... یہ احساس پیدا ہوا اور اُس کا چرچہ ہوا۔ تو خواب میں کلید بردار نے دیکھا کہ یہ کیا سوچتے ہو کہ آجکل کربلا میں وہ رونق کیوں نہیں ہوتی یہ کیا چرچے ہو رہے ہیں۔ کربلا میں یہاں کہاں ہوتا ہوں۔ میں تو ہندوستان میں ہوتا ہوں۔ ماشا اللہ اجر کم الی اللہ۔

وہ چاہے بتقاضائے سیاست میں کچھ اُن ضمیر کے جذبات کو دبا دیا ہو۔ ورنہ دنیا کو معلوم ہے۔ ہمارے ہاں کے غیر مسلم افراد نے بھی غم حسینؑ میں جتنا حصہ لیا۔ وہ بہت سے مسلمانوں کو توفیق نہیں ہوتی۔ اس طرح غم حسینؑ برپا کرنے کی۔ جس طرح عزائے حسین غیروں کے حلقے میں بسر ہوئی اس لیے معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کو کچھ خصوصیت حضرت امام حسینؑ کے ساتھ ضرور ہے۔ بہر حال مگر جب مولا نے یہ کہہ دیا کہ مجھے ملک چھوڑنے دو۔ تو ابن سعد نے لکھا ابن زیاد کو کہ اب جنگ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی حسینؑ یہاں تک تیار ہوئے ہیں کہ وہ ملک چھوڑ دیں گے اور ابن زیاد نے بھی خط کو دیکھ کر یہ کہا۔ یہ طبری کے صفحات پر موجود ہے کہ بالکل صحیح ہے۔ یہ بڑا خیر خواہانہ خط ہے۔ اب بنائے جنگ کوئی

نہیں ہے۔ مگر دربار میں اس وقت شمر موجود تھا۔ اُس نے، شمر نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے۔ اب اس میں رقیبانہ چشمک بھی ہے جو بڑے افراد میں ہوتی ہے عہدیداروں میں۔ کہ مجھے تو معلوم ہوا ہے کہ ابن سعد مل گیا ہے جا کر...... آدھی آدھی رات تک آپس میں گفتگو میں ہوتی ہیں اور یہ آپ کو غلط مشورہ دیا جا رہا ہے۔ اگر قبضے سے آپ کے آج نکل گئے تو عمر بھر نہیں آسکیں گے قبضے میں۔ اس کی وجہ سے ابن زیاد کو عمر سعد پر غصہ آیا اور اب اُسی غصے میں خط لکھا۔ تو اب خط کیا لکھا ہے۔ طبری کے صفحات پر الفاظ ہیں کہ ہم نے تم کو صلحوں کی گفتگو کے لیے نہیں بھیجا ہے۔ حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کرو۔ اگر بیعت نہ کریں۔ تو بس جنگ کرو۔

میں کہتا ہوں کہ مدت کی ایک بحث کا فیصلہ ابن زیاد نے اپنے خط سے کر دیا۔ صلحوں کے لیے نہیں بھیجا ہے۔ بیعت کا مطالبہ کرو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ صلح بیعت نہیں ہوتی۔ اور یہ خط ابن زیاد کا لیے ہوئے شمر آج نو محرم کی سہ پہر کو پہنچا ہے اور یہ خط پیش کر دیا ابن سعد کے سامنے...... ابن سعد نے نوعیت واقعہ کو فوراً سمجھ لیا اور یہ کہا کہ میرا خیال ہے کہ تمہیں نے وہ کام بگاڑ دیا ہے جو بن رہا تھا۔ اُس نے کہا اب ان باتوں سے کیا فائدہ...... یہ بتاؤ کہ تعمیل کرو گے یا تعمیل نہیں کرو گے اور اس کے ساتھ الگ سے ہدایت یہ تھی کہ اگر وہ تعمیل نہ کرے تو پھر سرداری لشکر سے یہ معزول اور تم سردار لشکر ہونا اور اس کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیج دینا۔ اب اُس نے کہا کہ...... اب یہ ابن سعد کا ایک تاریخی جملہ ہے طبری کے صفحات پر۔

واللہِ اِنَّ الحسینؑ لَا یُبَایِعُ

خدا کی قسم حسین بیعت تو نہیں کریں گے۔ اب یہاں طبری کے نسخوں میں ایک لفظ کا فرق ہے چونکہ "ذرا" قریب لفظ ہیں ایک طبری کا نسخہ جو عام چھاپوں میں ہے وہ تو یہ ہے۔

"اِنَّ نفسًا اَبِیّۃً بَیْنَ جَنْبَیْہِ" ۔

خدا کی قسم بیعت تو نہیں کریں گے ذات سے انکار کرنے والا ایک غیرت دار نفس

ان کے پہلو میں ہے یہ "نفسًا ابیتًا" کے معنی ہیں اور ایک دوسرا نسخہ اس کا ہے طبری کے بعض چھاپوں میں بھی ممکن ہے مل جائے اور قلمی طبری میں بھی شاید مل جائے۔ بس ذرا سا فرق ہے۔

وَاللّٰہِ اِنَّ نفسًا ابیتًا بین جنبیہ۔

اس لفظ کے تو وہ معنی ہوئے اور وہ دوسرا نسخہ یہ ہے۔

وَاللّٰہ انَّ نفسَ اَبِیْہِ بینَ جَنْبَیْہِ۔

وَاللّٰہِ انَّ حُسینًا لَا یُبایِعُ۔

خدا کی قسم حسین بیعت نہ کریں گے۔

اِنَّ نفسَ اَبِیْہِ بینَ جَنْبَیْہِ۔

ارے ان کے باپ کا دل اُن کے سینے میں ہے میں کہتا ہوں یہ جملہ بڑا دور رس ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے باپ کا دل اُن کے سینے میں ہے نہ ان کے باپ نے کبھی بیعت کی تھی۔ نہ یہ اُن کے بیٹے یہ بیعت کریں گے۔

اُس نے کہا کہ اس سب سے کچھ فائدہ نہیں، یہ بتاؤ کہ تعمیل کرو گے یا نہیں۔ اُس نے کہا کہ بہر حال تعمیل تو میں ہی کروں گا۔ کیا میں تمہیں سردار ہو جانے دوں گا۔ اب یہ آپس کی جیسے باتیں ہوتی ہیں اُس طرح کہ تم سمجھتے ہو کہ تمہیں سردار میں ہو جانے دوں گا...... جی نہیں...... تعمیل تو میں ہی کروں گا۔ مگر اب ہم...... ہر سنجیدہ آدمی غور کرے کہ وہاں تو یہ تھا کہ یا بیعت کریں اور یا جنگ کرو۔

اگر وہ اس پر بالکل عمل کرتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پھر پیغام بھیجتا بیعت کا نتیجہ تو قطعی تھا کہ آپ پھر انکار فرماتے۔ لیکن کچھ وقفہ درمیان میں پھر ہوتا۔ مگر اُسے تو بطور خود اُس نے طے شدہ سمجھ لیا کہ گویا یہ جز خلاف عقل ہے۔ خدا کی قسم حسینؑ بیعت نہیں کریں گے یعنی یہ تو مطالبہ ہی بے معنی ہے۔ یہ تو مطالبہ ہی غلط ہے۔ تصور ہی غلط ہے۔ لہٰذا اب یہ تو بے کار ہی

ہے۔ اب تو جنگ کرنا ہے اور اب ایک حریف منصب سامنے موجود ہے۔ لہٰذا اب جلدی ہو گئی بس اس لیے اب یہ آج...... آج سے عملاً کربلا شروع ہو گئی یعنی آج کی سہ پہر وہ ہے کہ ایک دم حملہ ہو گیا۔ بغیر اعلانِ جنگ۔ ابھی تک صلح کی گفتگو میں تھیں۔ پس منظر کے بالکل خلاف، ایکدم حملہ ہو گیا۔

بس اب مجھے مصائب میں شروع کر رہا ہوں کہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ منطق سے سمجھ میں نہیں آتی۔ اصحاب سب خیموں کے باہر۔ عزیز سب خیموں کے باہر۔ مگر حملہ جو ہوا تو گھوڑوں کے ٹاپوں کی صدا پہلے زینب کے کانوں میں پہنچی اور جناب فضہ سے کہتی ہیں۔ دیکھیو بھائی کیا کر رہے ہیں۔ جناب فضہ نے آ کے دیکھا کہ نماز عصر کے بعد ایک عمود خیمہ سے تکیہ کر کے تشریف فرما ہو گئے تھے اور جیسے نیند آ گئی ہے...... آرام فرما رہے ہیں...... آ کر عرض کر دیا کہ کوئی پاس نہیں ہے...... مگر یہ صورت ہے...... زینبؑ نے کہا: اب تو بہن کو بھائی سے کچھ کہنا ہے یہ کہہ کے آئیں اور گویا بھائی کا بازو ہلایا اور کہا...... بھائی آنکھ کھولیے حملہ ہو گیا۔

اب مولا نے آنکھ کھولی تو زبان پر تھا "ان للّٰہ وانا الیہ الرجعون" انہیں الفاظ میں میں نے کتاب میں بھی لکھا ہے۔ زینب کا دل ابھی گھوڑوں کی ٹاپوں سے...... ابھی دہلا ہوا تو تھا ہی، اب بھائی کی زبان سے یہ کلمہ سنا تو ایک دفعہ کہا...... کیوں بھائی...... کیا آپ اپنے مرنے کی خبر سنا رہے ہیں اور حسینؑ نے فرمایا کہ ہاں۔ میں نے نانا کو خواب میں دیکھا ہے کہ نانا فرما رہے ہیں کہ اے حسینؑ اب تم میرے پاس آیا چاہتے ہو۔ بس ایک دفعہ زینب نے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور جیسے غش کھا کے زمین پر گریں اور مولا نے بہن کا سر اُٹھا کے زانوں پر رکھا اور یوں کہتا ہوں کہ اشک افشانی کر کے ہوش میں لائے۔

اور اب بہلانے کا موقع نہیں ہے اب تو زینب کو مستقبل کے لیے تیار کرنا ہے۔ اس لیے بالکل جیسے پرسہ دیا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے یہی انداز ہوتا ہے کہ کسی کا بھائی چلا

جائے تو کہتے ہیں کہ عباسؑ کو یاد کرو۔ کسی کا بیٹا دنیا سے چلا جائے کہیں گے کہ علیؑ اکبر کو یاد کرو۔ وہی انداز ہے اب مولاؑ کا۔

بہن کو گویا اپنی تعزیت ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ مولا کو خبر ہے میرے بعد کوئی پرسہ دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ ارے پُرسہ کون دے گا آگ لے کے آجائیں گے...... کون پرسہ دے...... میں پُرسہ دے لوں...... تو وہی انداز ہے نہ پُرسے کا۔ تو فرماتے ہیں کہ بہن، ہمارے نانا ہم سے بہتر تھے۔ وہ نہیں رہے، ہماری ماں ہم سے بہتر تھیں وہ نہیں رہیں۔ ہمارے باپ ہم سے بہتر تھے وہ نہیں رہے۔ ہمارے بڑے بھائی ہم سے بہتر تھے۔ وہ نہیں رہے۔ جیسے ان سب کو صبر کیا۔ ماشاءاللہ آپ بے تاب ہوگئے......

جیسے ان سب کو صبر کیا ویسے ہم کو بھی صبر کرنا۔ بس جناب زینبؑ نے تو مرثیہ پڑھ دیا۔ حسینؑ نے تو جیسے تعزیت ادا کی اور اب زینبؑ نے جیسے پہلے ہی مرثیہ پڑھ دیا۔ وہ کیونکر انہوں نے مرثیہ پڑھا۔

انہوں نے کہا کہ نانا کا سایہ اُٹھا۔ تو چار تھے دل کو سنبھالنے والے۔ ماںؑ دنیا سے گئیں تو باپؑ موجود تھے۔ باپؑ کا سایہ جب اُٹھا تو دو بھائیؑ تھے بازو سنبھالنے والے۔ جب بھائی حسن مجتبیٰؑ گئے تو خدا حضور کو سلامت رکھے' آپ تھے۔ مگر اب آپ نہیں تو کون اور اب کہہ دوں کہ نثر کے فقرے ہیں مگر جیسے ہر ایک مرثیے کا ایک مصرعہ کہا ہے کہ:

اَلْیَوْمَ مَاتَ جَدِّی محمد المصطفیٰؐ۔

میرے نزدیک تو آج میرے نانا بھی دنیا سے اُٹھ رہے ہیں۔

اَلْیَوْمَ مَاتَتْ اُمِّی فَاطِمَةُ الزهرا۔

آج میری ماں فاطمہؑ زہرا بھی جا رہی ہیں۔

اَلْیَوْمَ مَاتَ اَبِی عَلِی المرتضیٰ۔

آج میرے باپ علیؑ مرتضیٰ بھی اُٹھ رہے ہیں۔

اَلْیَوْمَ مَاتَ اَخِی حسن المجتبیٰ۔

اور آج میرے بھائی حسن مجتبیٰ بھی جا رہے ہیں۔

کیا مطلب ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تک آپ زندہ تھے تو سب زندہ تھے میرے لیے اور اب آپ جا رہے ہیں تو میرے نزدیک آج ہی سب جا رہے ہیں۔ اب مولا نے انداز بدلا۔

انداز بدلا دیکھا کہ گویا منطق سے زینب خاموش نہیں ہو سکتیں۔ فرماتے ہیں کہ اے بہن تم کو میرے حق کی قسم کہ میرے بعد گریبان نہ پھاڑنا۔ تم کو میرے حق کی قسم کہ میرے بعد واویلا نہ کہنا۔ میں کہتا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ ہر بات سے غلط فائدہ بھی اٹھایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ زینب کبریٰ کے ان جملوں کو پیش کرتے ہیں غلط محل کے اوپر۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ عام احکام شرع ہوتے۔ تو اپنے حق کا واسطہ دے کے منع کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ یہ انداز خود بتاتا ہے کہ یہ عام احکام شرع نہ تھے یہ زینبؑ کے خصوصی موقف عمل کا تقاضا تھا۔ حسینؑ دیکھ رہے تھے کہ اگر زینب یہی رہی تو سکینہ کو کون سنبھالے گا۔ اگر زینب کا یہی عالم رہا۔ تو میرے سید سجاد کی خبر کون لے گا اور خدا کی قسم یہ مصائب عرض نہیں کرتا ہیں ورنہ یہ ایسے ہیں کہ انہی پر ختم کر دیا جائے۔ میں درمیان میں کہہ رہا ہوں۔ اس لیے اتنا زور دے کے بھی نہیں کہوں گا۔ مگر ایک حقیقت ہے کہ خدا کی قسم اب بی بی کے ضبط و صبر کو داد دیجئے کہ جو ایسی زینب ہو کہ ایک انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سن کے غش کھا جائے اور عصر کے بعد پھر غش نہیں آیا۔ ارے کیا ہو گیا۔

مگر اہل عزا ابھی تو محرم کی سہ پہر ہوئی ہے ارے پوری عاشور کی رات باقی ہے۔ ارے پورے عاشور کا دن باقی ہے۔ مگر میری طاقت اب کہاں وفا کر سکتی ہے اس لیے اپنے موضوع کے تقاضوں کے لحاظ سے کہ چونکہ نمازوں میں بھی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ اذانوں میں بھی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ حسین چاہتے تھے کہ نماز کو بھی جزو تاریخ بناؤں۔ اذان کو بھی

جزو تاریخ بناؤں۔ یہ ہے کہ صبح کی اذان علیؑ اکبر سے کہلوائی۔ مولا جانتے تھے کہ علیؑ اکبر بھولنے کی چیز نہیں ہے چاہتے تھے جب تک علیؑ اکبر یاد رہے تب تک ہماری اذان بھی یاد رہے۔

ارباب عزا۔ نماز بھی جیسی کربلا میں پڑھی گئی۔ ویسی تاریخ عالم میں نہیں پڑھی گئی۔ ارے ظہر کی نماز کہ دو صحابی سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں جو تیر آئے اپنے اوپر روکو...... حسینؑ کے عزادار فیصلہ کریں کہ یہ نماز پڑھی جا رہی ہے...... یعنی یوں تو کربلا کا پورا جہاد شریعت کی خاطر ہے۔ مگر یہ دو قربانیاں ہیں جو بلا شائبہ قیام نماز کی خاطر ہوئی ہیں ایک سعید عبداللہ حنفی اور ایک زہیر ابن قین سامنے کھڑے کر دیئے گئے۔ کہ ہم نماز پڑھتے ہیں تم ہمیں نماز پڑھواؤ۔ کون مجتہد ہے کہ فیصلہ کر سکے، اُن کی نماز افضل جنہوں نے مولا کے پیچھے نماز پڑھی۔ یا اُن کی نماز، جنہوں نے مولا کو نماز پڑھوائی ہے۔ وہ عوام نہیں تھے حسینؑ کے انصار فقیہ تھے...... جو ہر ایک عالم تھا...... کسی کو حق نہیں سوچے کہ انہوں نے نماز نہیں پڑھی۔

کون کہہ سکتا ہے کہ جب تیر کھانے کو جھکے تو رکوع نہیں کر لیا؟ اور جب سیدھے ہوئے قیام نہیں ہو گیا؟ اور اشاروں سے سجدے نہیں کر لیے؟ مگر اس نماز میں شریک نہیں ہوئے...... چونکہ شریک نہیں ہوئے وہ حکم امامؑ سے سامنے کھڑے ہوئے...... چونکہ شریک نہیں ہوئے وہ حکم امامؑ سے تصدیق عمل کرائیں...... صورت واقعہ یہ بتاتی ہے کہ اثنائے نماز ہی میں تیر اتنے کھا لیے تھے کہ اب کھڑے ہونے کی قوت نہ تھی...... مگر یہ قوت ارادی تھی کہ طے کر کے کھڑے ہوئے تھے کہ مولا نماز پڑھ لیں تو جب تک امام نماز سے فارغ نہیں ہوئے سعید زمین پر نہیں گرے...... ادھر یہ نماز سے فارغ ہوئے اُدھر وہ زمین پہ گرے اور اُٹھ کر پوچھتے ہیں اَوَفَیْتُ یَا اَبَا عَبْدُاللہ کیوں مولا میں نے فرض ادا کر دیا ہے اور امام فرماتے ہیں نَعَمْ وَفَیْتَ جَزَاکَ اللہُ خَیْرًا ہاں تم نے وفا کر دی...... اللہ تمہارا شمار نمازیوں میں کرے۔

ہاں اہل عزا۔ بس اب مجلس ختم، تاریخیں ختم اور میرا بیان اب ختم ہو جائے گا کہ یہ تو ظہر کی نماز ہے۔ اب میری مجال ہے جو عصر کی نماز کی کیفیت بیان کروں۔

بس یہ سمجھ لیجئے کہ راکب دوش رسولؐ پشت فرس پر نہیں ہے۔ اب نماز زمین پر ادا ہوئی ہے اب اس کے بعد میری مجال نہیں جو بتا سکوں کہ رکوع کس عالم میں ہوا...... قیام کس طرح ہوا...... مگر جو سجدے کو خصوصیت ہے وہی آخری جملہ کو تاریخ اسلام میں ایک اور نماز بھی یادگار ہے...... وہ اُنیس ماہ رمضان کو ہمارے مولا علیؑ کی صبح کی نماز ہے...... میں کہتا ہوں کہ یہ تو باپ کی میراث تھی...... باپ کے سر پر ضربت بھی نماز میں لگی بیٹے کے گلے پر خنجر بھی نماز میں چلا...... دونوں نمازیں جزو تاریخ مگر خود بارگاہ علیؑ میں عرض کروں گا۔

مولا آپ کی نماز بھی تاریخ اور آپ کا سجدہ بھی تاریخ مگر مولا آپ کو سجدے سے سر اُٹھانے کا موقع ملا اور حسینؑ...... حسینؑ نے تو بس سر سجدے میں رکھ دیا اور بخدا انہوں نے نہیں اُٹھایا وہ کوئی اور تھا جس نے سر بلند کر دیا۔ واحسینا۔ واحسینا۔

......☆......

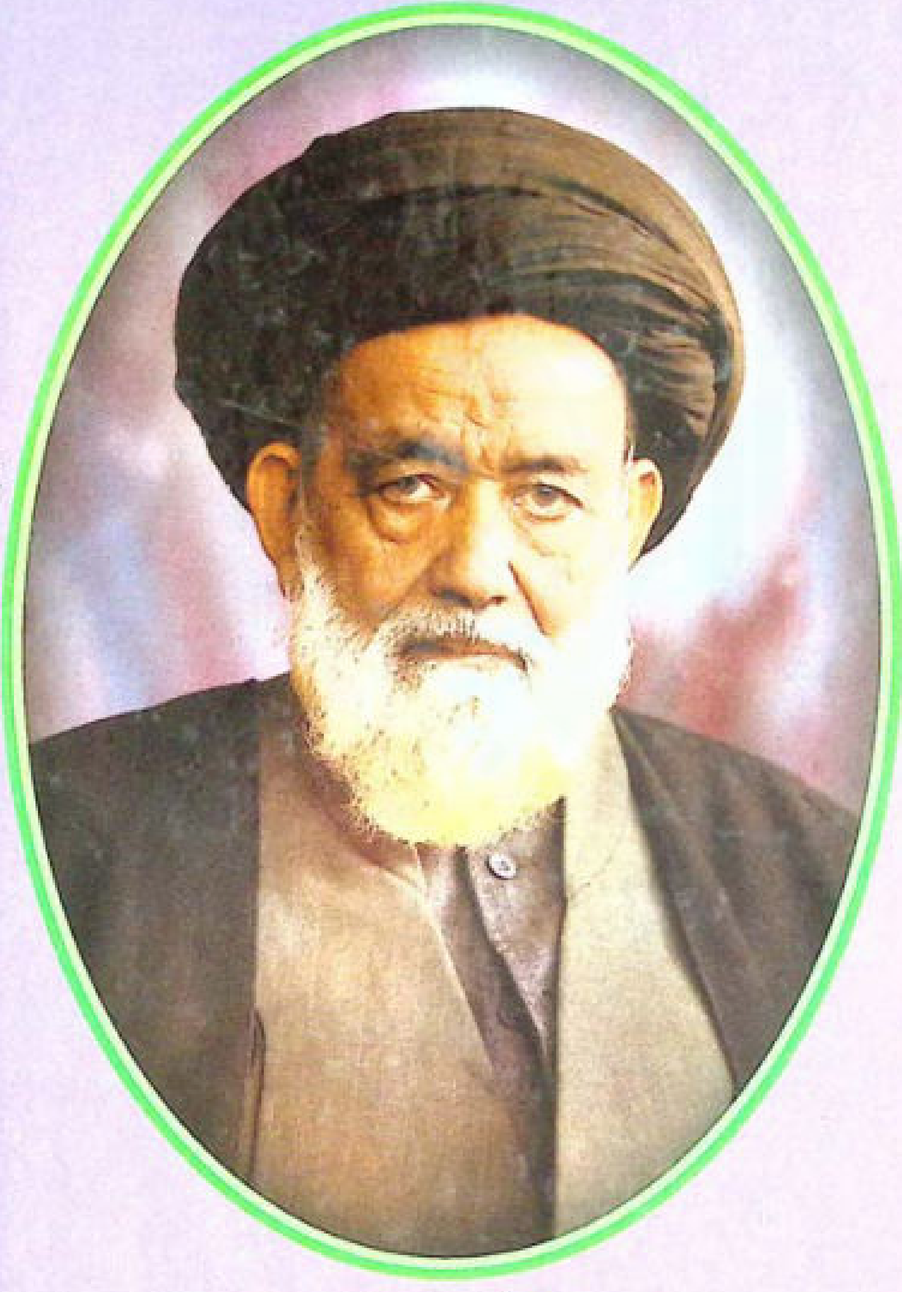

جناب آیۃ العلماء مولانا سید علی نقی النقوی نقن صاحب قبلہ مرحوم